—

مرتبہ :۔ محمد ایوب قادری

(مطبوعہ [illegible] پرنٹنگ پریس کراچی)

دائرہ معین المعارف

حق نشان ۔ ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۵

۱۹۶۶ء

قیمت۔ چار روپیہ

فہرست مضامین

یومِ عالمگیر

دائرۂ معین المعارف کراچی کے زیرِ اہتمام یکم مئی ۱۹۶۵ء بروز شنبہ بوقت شام شعیب محمدیہ ہائر سیکنڈری اسکول (ادارۂ شرقیہ) جیکب لائنز کراچی میں یومِ عالمگیر کی پرشکوہ اور باوقار تقریب منعقد ہوئی۔ اسکول کے احاطہ میں شاندار پنڈال بنایا گیا۔ اس تقریب میں جناب ممتاز حسن صاحب ستارۂ پاکستان منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان (کراچی) مہمان خصوصی تھے۔ وہ چھ بجے تشریف لائے کچھ دیر تک اراکین دائرۂ معین المعارف، ڈاکٹر سید معین الحق صاحب (صدر) سید سخاوت علی صاحب (نائب صدر) جناب مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب (خازن) جناب حامد حسین صاحب (نائب معتمد)، جناب فروغ علوی صاحب (نائب معتمد) وغیرہ سے دائرہ کی علمی سرگرمیوں پر گفتگو فرماتے رہے، ساڑھے چھ بجے مہمانِ خصوصی کے ہمراہ تقریباً سو اہلِ علم نے عصرانہ میں شرکت کی۔ عصرانہ کے بعد جناب مفتی انتظام اللہ صاحب کی طرف سے مہمانِ خصوصی کا خیر مقدم کیا گیا۔ مفتی صاحب کی طرف سے مندرجہ ذیل تقریر راقم الحروف نے پڑھ کر سنائی۔

جنابِ ممتاز حسن صاحب!

دائرۂ معین المعارف کے ایک رکن کی حیثیت سے میں اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ اُس مسرت اور جذبات تشکر کا

اظہار کروں جو دائرہ کے کارکنوں کو آپ کی تشریف آوری سے ہوئی ہے۔ جناب کی علم دوستی اور اس سلسلہ میں آپ کی شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں، کراچی کے سربر آوردہ علمی حلقوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی کارکردگی سے آپ نے اپنی دلچسپی کا اظہار نہ کیا ہو۔ ہم کو معلوم ہے کہ جناب کو ذاتی طور سے علامہ اقبال اور اقبالیات سے دلچسپی ہے۔ لیکن آپکی وسعت نظر کی شہادت ہم کو ان خطبات میں ملتی ہے جو وقتاً فوقتاً آپ مختلف اداروں کی محفلوں میں دیتے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے انتہائی باعث مسرت ہے کہ ہمارے دائرے کی محدود اور مختصر کوششوں کو بھی جناب نے بنظر پسندیدگی دیکھا اور اس کی اعانت فرمائی۔

جنابِ والا!

دائرۂ معین المعارف جس کے بانی ڈاکٹر سید معین الحق صاحب ہیں ابھی اپنی عمر کے تیسرے سال میں ہے لیکن شروع ہی سے دائرہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ ایک سہ ماہی ادبی رسالہ "بصائر" شائع کرے گا۔ اس کے چند شمارے پابندی سے نکلے مگر کچھ قانونی پابندیوں اور پریس کے تبادلہ کے سلسلہ میں اس کا ڈیکلریشن منسوخ ہو گیا۔ چنانچہ تقریباً چھ ماہ سے بصائر شائع نہیں ہو سکا۔ اب ڈیکلریشن مل گیا ہے اور جولائی سے انشاءاللہ باقاعدہ نکلتا رہے گا بصائر کا خصوصی شمارہ "ٹیپو سلطان نمبر" جناب کی نظر سے

گذرا ہوگا۔ دوسرے شمارے بھی شاید آپ نے ملاحظہ فرمائے ہوں، اس سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ہماری کوشش ہے کہ رسالہ معیاری رہے۔

دائرہ کی بے بضاعتی کے پیش نظر رسالہ کے علاوہ زیادہ اشاعت کا کام سرانجام نہ پا سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالہ شائع کرنے کا بار ہی دائرہ پر اتنا زیادہ ہے۔ کہ ہمارے کچھ کرم فرما اس کی مالی امداد نہ کرتے رہیں تو ہم اس کو بھی جاری نہیں رکھ سکتے۔ بہرحال کارکنان دائرہ نے ہمت نہیں ہاری ہے اور دائرہ کے صدر جناب ڈاکٹر معین الحق صاحب کی رہنمائی میں کام جاری رکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس وقت ہمارے ہاتھ میں ایک عظیم منصوبہ ابن اثیر کی تاریخ الکامل کی بارہ[۱۲] جلدوں کا اردو ترجمہ شائع کرنا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی کچھ جلدوں کا ترجمہ حیدرآباد اور آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اب یہ بھی نایاب ہیں۔ اس کے علاوہ یہ صرف ترجمہ ہے ہم نے مکمل کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور ہر جلد میں ضروری حواشی، مقدمہ اور تعلیقات وغیرہ ہوں گے ترجمہ کا کام مختلف حضرات کے جو اس فن میں دستگاہ رکھتے ہیں سپرد کیا گیا ہے۔ لیکن جنرل ایڈیٹر ڈاکٹر سید معین الحق صاحب رہیں گے۔ تبرکاً اس سلسلہ کی اشاعت دوسری جلد سے شروع کی گئی ہے

جو عہد رسالت پر ہے۔ یہ کام بھی توکل پر شروع کر دیا ہے یہی سبب ہے کہ کام کی رفتار زیادہ تیز نہیں۔ بہر حال کاپیاں لکھ لی گئی ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی پریس بھیج دی جائیں گی۔

ایک دوسرا اہم منصوبہ دائرہ کے سامنے ایک قاموس المشاہیر شائع کرنا ہے کارکنان دائرہ کا خیال ہے کہ یہ کتاب برطانیہ کی ڈکشنری آف نیشنل بیاگرفی کے خطوط پر ہونی چاہئے۔ ہمارے برصغیر کی مشہور شخصیتوں کے حالات تو انسائیکلوپیڈیا اور دوسری کتابوں میں قلمبند ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی لاتعداد شخصیتیں ایسی ہیں جن کے حالات ضبط کرنا ضروری ہیں۔ یہ کام ایک بورڈ کے سپرد ہوگا جس کے صدر ڈاکٹر معین الحق ہوں گے دائرہ کی خواہش ہے کہ جناب بھی اس منصوبہ کی سرپرستی فرما کر کارکنان دائرہ کی ہمت افزائی فرمائیں۔ اگر جناب والا اس تجویز کو پسند فرما کر اس کی سرپرستی کرنا منظور کریں تو ایک باقاعدہ منصوبہ تیار کر کے جناب کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے تاکہ آپ سے تبادلۂ خیالات ہو سکے۔

میں آخر میں دوبارہ جناب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس تقریب میں شرکت فرما کر ہم لوگوں کو مفتخر فرمایا۔ اور ممنوں ہونے کا موقع دیا۔

(انتظام اللہ شہابی)

اس تقریر کے جواب میں جناب ممتاز حسن صاحب نے دائرہ کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا، اس کے سہ ماہی آرگن "بصائر" پر گراں قدر تبصرہ فرمایا اور دائرہ سے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔

مغرب کے بعد باقاعدہ اجلاس شروع ہوا۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ "حرف آغاز" کے عنوان سے جناب مولانا اسد القادری صاحب نے ایک مختصر مگر دلچسپ تقریر میں جلسہ کے انعقاد کی غایت بیان کی اس کے بعد نائب معتمد جناب حامد حسین صاحب نے مہمان خصوصی جناب ممتاز حسن صاحب سے افتتاح کی درخواست کی۔ حامد حسین صاحب کی تقریر درج ذیل ہے۔

جناب ممتاز حسن صاحب!

اے آمدنت باعث آبادی ما

ارکین دائرہ معین المعارف کی طرف سے مجھے یہ عزت بخشا گیا ہے کہ میں جناب والا کو یوم عالمگیر کے افتتاح کرنے کی درخواست کروں۔

دائرہ کو قایم ہوئے ابھی صرف تین سال ہی ہوئے ہیں لیکن ارکین بالخصوص اس کے صدر اور بانی جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کے خلوص اور کوششوں کی بدولت اس نے ہماری علمی زندگی میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کا رسالہ بصائر ہر حلقہ میں پسندیدگی اور استناد کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ دائرہ کے مقاصد میں اردو کی ترویج و ترقی اور اس کو دنیا کی جدید اور مستند زبانوں میں جگہ پانے کا مستحق بنانے کی کوشش کے علاوہ اسلامی فنون

و تاریخ کا مطالعہ اور پاکستانی قومیت اور اخوت کا استحکام
بھی ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ تصنیف
و تراجم کے ذریعے ایسا مواد پیش کریں جو فوری مفاد کے
علاوہ آئندہ نسلوں کی رہنمائی کے لئے بھی مفید
ثابت ہو۔

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

ان ہی مقاصد کے پیش نظر دائرہ نے اسلامی تاریخ
کی ان مشہور شخصیتوں کا یوم منانے کا سلسلہ شروع کیا ہے
جن کے کارناموں کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے گذشتہ
سال یوم "ٹیپو سلطان" منایا گیا تھا اور جس قدر مقالے
پڑھے گئے وہ بصائر کے خصوصی نمبر میں شائع ہو چکے
ہیں ہم کو مسرت ہے کہ ہمارے اس اقدام کو نہ صرف پاکستان
میں بلکہ بیرون پاکستان بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا
ہے۔

آج دائرہ یوم عالمگیر منا رہا ہے، اس دن کی اہمیت
اس لئے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ اس کا افتتاح ایک ایسی
شخصیت کے ہاتھوں سے ہو رہا ہے جس کی ادب نوازی
اور علم پروری نے پاکستان کی علمی زندگی میں جان
ڈال دی ہے۔

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشۂ چشمے با کنند (حافظ)

اب میں کارکنان دائرہ کی جانب سے جناب والا سے

درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے اس اہم اجلاس کا افتتاح

فرما کر ہم لوگوں کو ممنون ہونے کا موقع دیں۔

(حامد حسین)

اس کے بعد جناب ممتاز حسن صاحب بتارۂ پاکستان نے اپنا افتتاحی خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں کی علم تاریخ سے وابستگی اور اس سلسلہ میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دئیے ہیں ان کو تفصیل سے بیان کیا۔ ہندوستان کے مسلم مورخین کا خاص طور سے حوالہ دیا۔ مسلمان سلاطین کی علم پروری، ثقافت دوستی اور بے تعصبی پر بھی روشنی ڈالی۔ عالمگیر اورنگ زیب اور اس کے عہد جہاں بانی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور دائرہ کی ان کوششوں کو واضح الفاظ میں سراہا جو کہ وہ ان اکابر کی یاد منا کر اچھی مثال قایم کر رہا ہے۔

اس کے بعد صدر ادارہ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے اپنا مطبوعہ خطبۂ صدارت پیش کیا۔ جس میں انہوں نے عالمگیر اور اس کے عہد کا ایک بھرپور جائزہ لیا تھا جس سے بعض وہ اعتراضات از خود رفع ہو جاتے ہیں جو بعض غیر مسلم مورخین نے عالمگیر پر لگائے ہیں۔ حاضرین نے ان کے خطبہ کو بہت دلچسپی سے سنا۔

ڈاکٹر معین الحق صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد ممتاز حسن صاحب نے دوبارہ تقریر فرمائی اور اس خطبہ پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور پرزور الفاظ میں یہ بات کہی کہ ایک مفصل اور جامع کتاب ڈاکٹر معین الحق صاحب کو عالمگیر پر لکھنی چاہئے جس میں خاص طور سے جادو ناتھ سرکار کی غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں کو طشت از بام کیا جائے۔

اس کے بعد جناب محی الدین رشید ہاشمی صاحب نے عالمگیر پر ایک نظم پڑھی۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل مقالے علی الترتیب پڑھے گئے۔

(۱) جناب حکیم محمد سعید صاحب نے "عالمگیر کے دور کے اطباء" کے عنوان سے ایک معلوماتی مقالہ پڑھا جس کو حاضرین نے بہت دلچسپی سے سنا۔

(۲) جناب سید عبدالواحد صاحب نے "عالمگیر اور علامہ اقبال" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا اور بتایا کہ اس مغل شہنشاہ کو علامہ نے کن زوردار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

(۳) بیگم ممتاز معین نے اپنا مقالہ "زیب النساء بیگم" پڑھا اور پرزور دلائل کی روشنی میں ان بے بنیاد اعتراضات کو انہوں نے رفع کیا جو زیب النساء بیگم کے کردار پر لگائے جاتے ہیں۔

(۴) بیگم عظیم النساء صلاح الدین نے "عالمگیر اور معاشرتی اصلاحات" کے عنوان سے مقالہ پڑھا جس میں انہوں نے بتایا کہ عالمگیری دور میں کیا کیا معاشرتی اصلاحات عمل میں آئیں۔

(۵) ساجد علی صاحب اور جناب شکور معصومی صاحب نے دو نظمیں پڑھیں۔

(۶) آخر میں جناب سخاوت علی خسرو صاحب نے عالمگیر پر ایک مقالہ پڑھا۔

چونکہ رات کے تقریباً ساڑھے دس بج چکے تھے اور بہت سے مقالے رہ گئے تھے اس لئے جلسہ دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

۲ مئی ۱۹۶۵ء کو بروز یکشنبہ بعد نماز مغرب یوم عالمگیر کا دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ مندرجہ ذیل مقالے علی الترتیب پڑھے گئے۔

(۱) سب سے پہلے سید محمد بیدری نے "عالمگیر اور بیدر" کے عنوان سے ایک جامع اور معلوماتی مقالہ پڑھا اور بتایا کہ عالمگیر کے دور کے کون کون سے آثار اور یادگاریں وہاں آج بھی موجود ہیں۔

(۲) جناب سید سعید اختر زیدی صاحب نے "عالمگیر اور داراشکوہ کے تعلقات" کے عنوان سے مقالہ پڑھا، اس مقالہ پر ڈاکٹر معین الحق صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ چونکہ فاضل مقالہ نگار نے بالکل نئے انداز سے اس عنوان کا مطالعہ کیا ہے اس سے ان پر بڑی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ جو بات کہیں دلائل و براہین کے اعتبار سے کمزور نہ ہو۔

(۳) جناب سراج رضوی صاحب ایڈوکیٹ نے "عالمگیر میری نظر میں" کے عنوان سے ایک دلچسپ مقالہ پیش کیا۔ رضوی صاحب کا مقالہ تاریخی معلومات کے علاوہ ادبی چاشنی سے بھرپور تھا۔

(۴) پروفیسر عبد المجید صدیقی صاحب نے "مرشد قلی خاں کی مالی اصلاحات" کے عنوان سے ایک پر مغز مقالہ پڑھا صدیقی صاحب کا مقالہ بہت قیمتی معلومات کا حامل تھا۔

(۵) جناب نصیب اختر صاحب نے "عالمگیر کی ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا اور دستاویزی ثبوت کی روشنی میں ان الزامات کی تردید کی جو عالمگیر پر لگائے جاتے ہیں۔

(۶) جناب انوار احمد قادری صاحب نے "عالم اسلام میں فتاوائے عالمگیری کی اہمیت" کے عنوان سے ایک دلچسپ مقالہ پڑھا۔ اور بتایا کہ عالم اسلام نے فتاوائے عالمگیری سے کس قدر اعتنا کیا ہے۔

(۷) جناب فروغ علوی کاکوروی صاحب نے عالمگیر اور شاہجہاں کی خط و کتابت پر ایک مقالہ پڑھا۔

(۸) جناب پروفیسر محمد حامی الدین صاحب نے عالمگیر کی دکن پالیسی پر ایک مقالہ پیش کیا یہ مقالہ ان کی طرف سے جناب ساجد علی صاحب نے پڑھا۔

مقالوں کے اختتام پر جناب انعام الرحیم صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ مقالوں پر اظہار پسندیدگی فرمایا اور دائرۃ معین المعارف کی ان علمی و ادبی سرگرمیوں کی واضح الفاظ میں تعریف کی۔

آخر میں جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے کسی بھی حیثیت سے جلسہ کو کامیاب بنایا اور اس میں دلچسپی لی۔ آخر میں جناب پروفیسر حامی الدین صاحب پرنسپل شعیب محمدیہ سیکنڈری اسکول نے، ڈاکٹر معین الحق صاحب اور ارکین دائرہ کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس علمی تقریب کے انعقاد کے لئے ہمارے اسکول کو منتخب فرمایا۔ ۱۱ بجے بخیر و خوبی جلسہ ختم ہوا۔

محمد ایوب قادری

جناب ممتاز حسن صاحب
کی
افتتاحی تقریر کا خلاصہ

مجھے بڑی مسرت ہے کہ آپ یوم عالمگیر منا رہے ہیں۔ اورنگ زیب اس برصغیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی حکومت کا زمانہ پچاس سال سے اوپر ہے اور وہ زمانہ اہم واقعات سے پر ہے، اورنگ زیب جب تخت نشین ہوا تو اس کے سامنے بہت سے مسائل تھے اس کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں اسلامی روایات کی تجدید ہونی چاہیئے اور یہ بھی کہ اس تجدید کے لئے وہ خود ہر طرح سے موزوں ہے۔ اس کا زہد و تنسک اور شعائر اسلامی کی پابندی اس کے اسی جذبہ کی مظہر ہیں۔ اس کے نتائج دور رس ثابت ہوئے۔ ہندو امراء اور رعایا جو اکبر کے وقت سے غیر معمولی رعایتوں کے عادی تھے اس کے رویئے سے بدگمان ہوئے اور جب اس نے جزیہ دوبارہ عائد کیا اور نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی لگادی تو ہندوؤں کی ناراضگی اور بھی بڑھ گئی اور وہ یہ بات بھی

بھول گئے کہ نئے مندر بنانے کی ممانعت کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب نے پرانے مندروں کے لئے زرِ اعانت اور جاگیریں بھی منظور کی تھیں مرشٹوں سے جو لڑائیاں ہوئیں وہ اگرچہ سیاسی نوعیت کی تھیں مگر ان کو مذہبی رنگ دے دیا گیا۔ یہی حال اورنگ زیب کی دکن والی مہموں کا ہوا جس میں اس کی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ صرف ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اور ہندو مورخوں نے اورنگ زیب کو ایک جابر اور متعصب حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا۔ حتیٰ کہ سر جادو ناتھ سرکار جیسا آدمی بھی جو ہمارے زمانے میں عالمگیر کے مورخ کی حیثیت سے مشہور ہے تعصبات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور اورنگ زیب کی بُرائی ثابت کرنے کے لئے اس نے خود اسلام کو بھی بُرا کہا۔

آج اگر ہم اورنگ زیب کی شخصیت اور زمانۂ حکومت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اورنگ زیب کی ساری حکمت عملیوں اور انتظامی کارروائیوں پر ایک منصفانہ اور غیر جانبدارانہ نظر ڈالنے کی کوشش کریں اور یہ سوچیں کہ وہ کونسے عوامل و عناصر تھے جن کی وجہ سے اورنگ زیب کو اپنی کوششوں میں کامیابی نہ ہو سکی۔ یہ نہیں کہ ہم جادو ناتھ سرکار کے یا دوسرے مورخین کے تعصب کے مقابلے میں اپنا تعصب لائیں اور اورنگ زیب کی ہر بات کو خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اچھا ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اورنگ زیب کو اچھا ثابت کرنے کی بجائے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی غلطیوں سے سبق لیں اور اپنے زمانہ میں ایسی غلطیوں سے اجتناب کریں تاریخ کے مطالعہ کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہم ماضی کے مطالعہ سے اپنے حال اور مستقبل کی اصلاح کریں۔

تاریخ کا مطالعہ اسلامی روایات کا حصہ ہے۔ قرآن کریم میں پرانی امتوں کی سرگذشت کو بار بار دہرایا گیا ہے اور ان کے اعمالِ نیک و بد کی طرف ہمیں خاص طور پر متوجہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے آج سے پہلے بڑے بڑے مورخ پیدا کئے ہیں، طبری، ابن الاثیر اور المقریزی جیسے مورخ اتنا بلند مقام رکھتے ہیں کہ ان کا ہمسر مشکل سے ملے گا۔ ابنِ خلدون دنیا کا سب سے پہلا فلسفی مورخ ہے۔ اسی طرح اور بہت سے مورخ ایسے ہیں جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس برصغیر کے اسلامی دور میں ضیاء الدین برنی، ابو القاسم فرشتہ اور ابو الفضل جیسے عظیم الشان مورخ ہو گذرے ہیں۔

اورنگ زیب کے متعلق اقبال نے جن جذبات کا اظہار کیا وہ عقیدت مندی کی حد میں داخل ہے۔

شاہ عالمگیر گردوں آستاں

اعتبار دودمان گورگاں

درمیانِ کارزار کفر و دیں

ترکش مارا خدنگِ آخریں

ان دونوں شعروں کے سننے کے بعد میرا شمار بھی اورنگ زیب کے عقیدتمندوں میں ہونا چاہئے تھا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ میرے دل میں اورنگ زیب کے لئے بڑی عزت ہے البتہ اس کی سیرت کے ایک پہلو سے میں مطمئن نہیں ہوں اور وہ یہ کہ نہ اس کو کسی پر اعتماد تھا نہ کسی کو اس پر۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ انتظامی امور کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے رفیقوں اور زیردستوں پر اعتماد کر سکے۔ اور اسے ان کا اعتماد

بھی حاصل ہو۔ آپ میری رائے سے متفق ہوں یا نہ ہوں یہ مسئلہ غور طلب ضرور ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے اپنے زمانہ میں فن تاریخ سے مسلمانوں کو وہ دلچسپی نہیں رہی جو انہیں اس سے پہلے تھی۔ بیسوی صدی کے مسلمان مورخوں میں سب سے بڑا نام مجھے اپنے مرحوم بھائی ڈاکٹر محمد ناظم کا نظر آتا ہے جنہوں نے محمود غزنوی کے حالات اور واقعات کی تحقیق پر ایک عمر صرف کی۔ اور جن کی تصنیف آج بھی ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب جب کہ ہم آزاد ہیں ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنے تاریخی ذوق کو دوبارہ زندہ کریں مجھے یقین ہے کہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی کوششیں ہمیں اس ارادے کی تکمیل میں مدد دیں گی، کسی قوم میں ایک مورخ کا پیدا ہونا اس قوم کے لئے عزت اور فخر کی بات ہے۔ اور اور یہ عزت اور یہ فخر ہمارا پیدائشی حق ہے۔

یوم عالمگیر

خطبہ صدارت

از

ڈاکٹر سید معین الحق

خواتین و حضرات:

آج جس شخصیت کی یاد منانے اور صحیح تاریخی پس منظر میں اس کی تصویر پیش کرنے کی غرض سے یہ جلسہ طلب کیا گیا ھے، کیا اس کا مقام واقعی اسقدر بلند ھے کہ اب ڈھائی سو سال گذرنے کے بعد بھی اس کے ذکر کو تازہ کرنا ضروری سمجھا جائے؟ یوں تو مورخ کے نزدیک ماضی کا ھر واقعہ اور اس سے متعلق ھر شخص کسی نہ کسی حیثیت سے اھم ھے لیکن بعض شخصیتوں کا کردار تاریخ سازی کی تاریخ میں اتنا نمایاں ھو جاتا ھے، کہ ان کو بھلایا نہیں جاسکتا، ان کے پہچاننے کا ایک ھی طریقہ ھے، کیا تہذیب انسانی کی تعمیر میں انھوں نے کوئی اینٹ ایسی رکھی ھے جس کو ھٹا دینے سے اس ختم نہ ھونے والی عمارت میں کسی قسم کی کمزوری یا عیب نظر آنے لگے؟ اسی معیار پر ھم کو چاھئے کہ عالمگیر کے کارناموں کو جانچیں، تہذیب و تمدن کی یہ

عمارت اتنی وسیع اور مزین ہے، اس کی تعمیر و تزئین میں ایسی صناعی و کمالات کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور اس کے نقش و نگار میں ایسی خوبیاں پیدا کی گئی ہیں کہ اس کے لاتعداد معماروں کی کارکردگی ایک دوسرے سے علٰحدہ بھی ہے اور متصل و ہم آغوش بھی، کیا عالمگیر کا بھی کوئی کارنامہ ہم کو اس کی دیواروں میں کہیں نظر آتا ہے، اور اگر نظر آتا ہے تو کس شکل میں، اور عمارت کے کسی حصہ کو مضبوط یا مزین کرنے میں اس سے مدد ملی ہے ؟ ان سوالوں کے جوابات کے لئے تاریخ کے بعض گوشوں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے

اکبر نے حربی فتوحات اور نظم حکومت کی اصلاح، اور جہانگیر و شاہ جہاں نے مصوری اور فن تعمیر میں دلچسپی لے کر جسطرح زندگی کے ان گوشوں کو سنوارا، وہ ہر شخص جانتا ہے، لیکن عالمگیر کے متعلق اکثر مورخ یہی کہتے ہیں کہ اس نے مندر گروائے، ہندوؤں کو ناراض کیا اور دکن میں ایک طویل جنگ کا سلسلہ شروع کرکے مغلیہ حکومت کے وسائل اور وقار کو سخت صدمہ پہونچایا، ان میں سے بعض نے تو اس کی ایسی بھیانک تصویر پیش کی ہے، جس کا تصور بھی مشکل ہے، مثلاً وہ اس کو مکار اور ریاکار کہتے ہیں، اس کا مسجد میں جا کر پابندی سے نماز با جماعت ادا کرنا، اس کا روزے رکھنا، اور کبھی کبھی مسجد میں جاکر شب بیداری کرنا، کچھ دنوں کے لئے زمین پر سونا اور فقط جو کی روٹی کھانا، ان عبادات کا ذکر کرکے سب کا مقصد یہ لوگ یہی بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے

جرائم پر تقدس کا پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ دور جدید میں ہماری تاریخ نویسی کی جو روایات قائم ہو گئی ہیں ان کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ان ہی مورخوں کے خیالات کو منبع معلومات تسلیم کیا ہے اور ان ہی کے طرزنگارش کو معیار بنا لیا ہے' عالمگیر کے زہد و تقویٰ پر تنقید کرتے وقت ہم کو یہ دیکھنا چاہئے. کہ یہ خصوصیات اس کی زندگی میں کسوقت سے نظر آتی ہیں - ۱۶۴۳ع میں جب اس کا عنفوان شباب تھا' اور ابھی جنگ تخت نشینی میں پندرہ سال باقی تھے تو آسنے طے کیا کہ تارک‌الدنیا ہو کر مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں پر اپنا سارا وقت عبادت میں گذارے' علائق دنیوی کو اس طرح یکسر ختم کر کے ایک سال تک فقیری کی زندگی گذارنے کو حصول تخت کے لئے ایک مکارانہ چال کہنا' جہل نہیں تو کیا ہے ؟ یہ حضرات اتنی کھلی ہوئی بات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اگر اورنگ زیب کے دل میں اسی وقت سے حصول تخت کی تمنائیں موج زن ہوتیں تو سب سے پہلے وہ ایک مستعد فوج اور زبردست خزانہ مہیا کرنے کی تدبیر کرتا

یہ امر تو کسی سے پوشیدہ نہ تھا کہ شاهجهاں کے چاروں لڑکے عمر رسیدہ' بلند حوصلہ' اور صاحب ثروت ہونے کے علاوہ بڑے بڑے صوبوں کے گورنر بھی تھے' ان حالات میں کوئی وجہہ نہ تھی کہ تخت نشینی کا مسئلہ اختلافات کا باعث نہ بنتا' یہ ضرور ہے کہ شاهجهاں اور دارا نے ایسے حالات پیدا کردئے کہ جنگ قبل از وقت ہی شروع ہو گئی لیکن اس کا

امکان تو برسوں پہلے نظر آنے لگا تھا، اس وقت کے لئے ترک دنیا اور فقیرانہ زندگی کس طرح موزوں تدبیر ہوسکتی تھی؟ اور اگر اسکو مکارانہ چال سمجھا جائے تو وہ کسطرح اسکو تخت تک پہنچانے میں مفید ثابت ہوسکتی تھی؟ تاریخ یہ تو نہیں بتلاتی کہ لوگ فقرا، اور زہاد کو تخت نشین کرتے رہے ھیں۔

شہنشاھی تک پہونچنے کے لئے اور اقتدار اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد عالمگیر نے جن پالیسیوں اور اصلاحات کا اجرا، کیا، ان پر متعدد اعتراضات کئے گئے ھیں، معترضین میں اکثریت تو ان مورخوں کی ھے جن کی پہنچ ھم عصر اور اصلی ماخذ تک نہیں، اسلئے وہ مغربی مورخوں کی تصانیف اور تراجم پر اپنے مطالعہ کا انحصار کرتے ھیں، یہہ دونوں اکثر گمراہ کن ثابت ہوتے ھیں، جہاں تک ترجموں کا تعلق ھے بہت کم ایسے ھیں جن میں اصل عبارت کی روح موجود رہتی ھے اور کبھی کبھی تو ایسی فاش غلطیاں نظر سے گذرتی ھیں جو کسی حالت مین معاف نہیں کی جا سکتیں، مثلاً عبدالقادر بدایونی کی تاریخ منتخب التواریخ کے مترجمین نے مہدویہ کو مہادیو پڑھا، اور پھر سید محمد جونپوری کو اس دیوتا سے متعلق کر کے ان پر ظلم توڑا ھے۔ کیا وہ مصنف جو صرف اس ترجمہ کو پڑھے اور ساتھہ ھی عبدالقادر کو مستند خیال کرتا ہو، غلط نتائج اخذ کرنے سے بچ سکتا ھے؟ یہہ یقیناً انتہائی مثال ھے، لیکن انگریزی ترجموں مین ھم کو قدم قدم پر ایسے بیانات ملتے ھیں جو گمراہ کن کہے جا سکتے ھیں،

عہد عالمگیر کے سر بر آوردہ مورخوں میں جادو ناتھہ سرکار اور لین پول' سر فہرست ہیں' ان دونوں نے اصلی ماخذ سے فائدہ آٹھایا ہے' اگرچہ اول الذکر فارسی نہیں جانتے تھے' لیکن وہ منشیوں کے ذریعہ فارسی ماخذ کے ترجمے کرا کر ان کو پڑھتے بھی تھے اور گہ بہ گاہ اپنے نام سے شایع بھی کر دیتے تھے۔ ان دونوں نے عالمگیر کی بعض خصوصیات اور ذاتی اوصاف کی تعریف کی ہے' اس کی ذہانت' شجاعت' اور علمی صلاحیتوں کے علاوہ اسکی دین داری اور تقویٰ کا بھی وہ اعتراف کرتے ہیں' لیکن لین پول نے نرم اور ایک حد تک معذرت آمیز لہجے میں اور سرکار نے انتہائی تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عالمگیر میں تو بہت سی خوبیاں تھیں مگر وہ بے بس تھا کیوں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اسکو وہ پالیسیاں اختیار کرنی پڑیں' جن کے انتہائی خراب نتائج برآمد ہوئے۔ حقیقت یہہ ہے کہ اس نظریہ کو پیش کرتے وقت سرکار ایک مشنری کا لبادہ اوڑھہ لیتے ہیں اور اپنی مورخانہ حیثیت کو بھول جاتے ہیں۔ "اسلامی کلیسائی ریاست ہندوستان میں" The Islamic State Church in India کے عنوان سے انھوں نے اپنی مشہور کتاب کی تیسری جلد میں ایک باب قائم کیا ہے۔ اسمیں اسلامی ریاست پر انھوں نے جس انداز سے تبصرہ کیا ہے' اسکی حقیقت کا اندازہ لگانے کے لئے چند فقرے کافی ہیں' وہ فرماتے ہیں: "اسلامی ریاست اصولی طور پر ایک تھیا کریسی ہے جس میں تمام وسائل اور ساری قوتیں حکومت اور سیاسی اقتدار کے تحت' سچے دین کے

مشنری پروپاگینڈا کے لئے وقف ہوتی ہیں' اسلئے اسلام کے علاوہ
کسی دوسرے مذہب کو باقی رہنے دینا گناہ کے مترادف ہے'' اسی
طرح جہاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام کی فتح
کے بعد' جو لوگ لڑائی میں شریک تھے آن کا قتل یا آن کو
غلام بنانا ضروری ہے' ان کے اہل وعیال بھی غلام ہو جاتے ہین -
جو جنگ مین شریک نہ تھے' اگر ان کو قتل نہ کیا جائے تو
ترغیب دی جائے کہ اسلام قبول کرین، غرضکہ ''ساری آبادی
کو مسلمان بنانا اور ہر قسم کے اختلاف کو کچل دینا''
اسلامی ریاست کا نصب العین ہے' اسی قسم کی اور بے بنیاد باتین
اس باب مین بھری ہوئی ہین' ایک دلچسپ، بات یہ ہے کہ
اسلام کے ان بنیادی اصولوں پر رائے زنی کے سلسہ مین انھوں
نے علاؑالدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو بطور دلیل
پیش کی ہے۔ آپ حضرات اب سمجھ گئے ہون گے' کہ پروفیسر
مذکور آپ کو کہاں لئے جارہے ہین'۔ وہ یہ ثابت کرنے کی
کوشش کر رہے ہین' کہ اسلامی ریاست مین رواداری کا تو
ذکر ہی کیا ہے' یہاں دوسرے مذہب کے پیروون کو رہنے کی
اجازت اسی صورت مین دی جاسکتی ہے کہ آنکو غلامی کا درجہ
دیاجائے۔ عالمگیر اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتا تھا' اس لئے
اس کی حکومت مین ان خرابیوں کی موجودگی ناگزیر تھی' بہ
الفاظ دیگر' ان خرابیوں کا ذمہ دار' ایک فرد نہین' بلکہ اسلام
تھا - اب غور کیجیے اور بتلائے کہ مورخوں کے اس
استدلال اور تاریخ نویسی کے ان تصورات نے جو غلط فہمیاں پیدا
کردی ہین' انکو دور کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟ کیا اسمین شک

کی گنجائش باقی رہ جاتی ھے کہ پروفیسر سرکار یا تو تھیاکریسی
کا مفہوم نھین جانتے یا اسلامی ریاست کے تصور سے ناواقف ھین
تھیاکریسی' پروھتون اور مذھبی پیشواؤن کی حکومت ھے ۔ اسلام
مین خود پروھت کے لئے ھی کوئی مقام نھین' نہ کلیسیا کا یہان
کہین نشان ملتا ھے' تو پھر اسلامی ریاست تھیاکریسی کیسے ہو
سکتی ھے ؟ پروفیسر مذکور جوش مین آکر یہ بھی بھول گئے کہ
اپنے ایک ھزار سالہ دور اقتدار مین مسلمانون نے کبھی کلیسا یا
اس سے متعلق کوئی محکمہ حکومت کے تحت قائم نہ کیا'
بر خلاف اس کے برطانوی عہد اقتدار مین ایسا کیا گیا ۔ اسلامی
دور حکومت میں تبلیغ دین کا کام انفرادی اور نجی کوششوں
ھی تک محدود رھا ۔

اب ذرا ھم اس طرف بھی توجہ کریں کہ عالمگیر کی
پالیسیون کا وہ کون سا گوشہ ھے' جس کی وجہ سے مورخون مین
اس کے خلاف اسقدر تعصب پیدا ھو گیا ھے' جملہ اعتراضات کو
یکجا جمع کر کے اگر ان کا تجزیہ اور مقابلہ کیا جائے تو
معلوم ھوگا کہ اس شہنشاہ کے اسی کارنامہ کو سب نے
ھدف ملامت بنایا ھے جو ایک حقیقت پسند ناقد کی نظر مین' اس
کی سب سے اھم خدمت ھے' اور جس کی بدولت وہ تاریخ کے
صفحات مین ایک بلند مقام پر نظر آتا ھے' اسلامی معاشرہ کی
تشکیل آن تصورات پر ھوتی رھی ھے جن کو ھم شریعت کے
بنیادی احکام کہ سکتے ھین اور جن کا منبع قرآن اور سنت ھین
جب تک اسلامی دنیا کی وحدت قائم رھی معاشرہ بھی ایک ھی

تھا' یعنی اسلامی تمدن کی ایک ہی عمارت تھی کچھ مدت کے بعد مختلف علاقون مین علیحدہ علیحدہ اور خود مختار حکومتین وجود مین آگئین' گویا متعد معاشرے بن گئے' لیکن اسلامی تعلیمات کی وجہ سے بنیادی طور پر یہ معاشرے یکسان ہی تھے' ان کو ایک عمارت تو نہین کہا جاسکتا تھا لیکن ان کی یکسانیت مین نہ کوئی شبہ تھا' اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ چارفقھی مذاہب جو ابتدا مین قائم ہو گئے تھے ہر اسلامی حکومت نے ان ہی مین سے کسی ایک کو تسلیم کر لیا' انفرادی زندگی مین بھی ان ہی مین سے ہر مسلمان کسی ایک کی پیروی کرتا تھا' حکومت کا فرض تھا' کہ وہ نظم حکومت کے ڈھانچہ کو ان ہی حدود کے اندر رکھے اور جو اسلامی شریعت کے احکام اور قوانین کی خلاف ورزی کرے اس کو سزا' دے۔ شریعت کے احکامات تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے مفید تھے یا اس کے راستے مین رکاوٹین پیدا کرتے تھے' یہ مسئلہ ہمارے موضوع سے باہر ہے' ہان اس سلسلہ مین یہ ذکر کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ مین شریعت کی بالا دستی جب تک مکمل طریقہ پرقائم رہی' مسلمان' تہذیب و تمدن کے میدان مین سب سے آگے نظر آتے ہین' یہ وہی زمانہ ہے جب یورپ مین عہد تاریک کا دور تھا' ہر شخص جانتا ہے کہ اس زمانہ مین علم و تحقیق کی مشعل مسلمانون کے ہاتھہ مین تھی اور یہی زمانہ تھا جب مسلم رہنما' تہذیب و تمدن کی عمارت کوتیزی کے ساتھہ بلند کر رہے تھے - آن کے کارنامون کو ہم یورپ کی تحریک اور بعدہ مغربی تہذیب کے نقش و نگار مین بھہ آسانی دیکھہ سکتے ہین'

بد قسمتی سے اسلامی معاشرہ یا یوں کہئے کہ مختلف علاقوں کے اسلامی معاشرے دوسرے معاشروں کی طرح اندرونی اور بیرونی صدموں سے محفوظ نہ رہ سکے، بر صغیر کی تاریخ میں اسلامی معاشرہ کو سب سے زبردست صدمہ دین الہی کے حملہ سے پہونچا، اس سے قبل بھی شریعت کی خلاف ورزیاں کی جاتی تھیں، لیکن اُن کے پیچھے کوئی منظم سازش نہ ہوتی تھی، ان کا ارتکاب اکثر وقتی ضروریات کی آڑ لے کر یا انفرادی نا اہلی کی بنا، پر ہوتا تھا، لیکن اکبری عہد میں جو نئے دین کی بنیاد رکھی گئی وہ ایک منصوبہ کے تحت تھی، اس سازش کا تجزیہ قدرے تفصیل چاہتا ہے۔ مطلق العنانی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسکی ہوس اقتدار کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، اقتدار کے زینے پر جوں ہی اسکا قدم آگے بڑھتا ہے، اس کو اگلی سیڑھی پر پہنچنے کی فکر ہو جاتی ہے، یہ سلسلہ لا متناہی نظر آتا ہے، اور اسوقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ یا تو کوئی زبردست رکاوٹ نہ پیدا ہو اور یا حکمران کی زندگی ختم نہ ہو جائے، اکبر کے ساتھ بھی یہی ہوا، وہ اپنے اجداد میں سے اکثر کی طرح نہایت ذہین، بلند حوصلہ، باہمت، بہادر اور صلاحیتیں رکھنے والا حکمران تھا، جن ناموافق حالات میں وہ چودہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا، ان کے پیش نظر اسکی وسیع فتوحات اور ایک مستحکم نظم مملکت کا قیام و استقلال، ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے، جس پر دنیا کا کوئی حکمران بھی فخر کر سکتا ہے، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ابھی اس کے شباب کا آغاز ہی تھا کہ اس کی بلند حوصلگی،

بیرام خاں کے اقتدار سے پنجے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی اور عمر کے اٹھارھویں سال ھی میں اس نے اپنے قدیم اور وفادار اتالیق کے روزانہ بڑھتے ہوئے اقتدار کو کچل کر رکھہ دیا' دو سال کے اندر حرم کی ان عورتوں اور دربار کے ان امراء سے بھی اس نے پیچھا چھڑا لیا جنھوں نے اس موقع پر اس کا ساتھہ دیا تھا' گویا بیس سال کی عمر میں وہ پکا مطلق العنان حکمران بن گیا' اب کوئی اسکے اقتدار کی طرف آنکھہ اٹھا کر نہیں دیکھہ سکتا تھا۔ کچھہ امراء نے علم بغاوت بلند ضرور کیا' لیکن یہ بغاوتیں بہ آسانی فرو کردی گئیں' سندھ' کشمیر' اور دکن کے علاوہ سارا برصغیر اور موجوہ افغانستان کا وسیع علاقہ مغل حکمران کے زیر نگین آگیا' اس کی کوئی خواھش ایسی نہ تھی جو پوری نہ ھوتی' ماسوا اس کے کہ اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ وہ چاھتا تھا کہ اس کے لڑکا پیدا ھو اور زندہ رہے چنانچہ شیخ سلیم چشتی رح سے اس نے دعا کی درخواست کی' بالآخر شہزادہ سلیم پیدا ھوا اور زندہ رھا۔ اسکے چند سال بعد ھی فیضی اور ابوالفضل دربار سے منسلک ھوگئے' ان دونوں بھائیوں کو اور ان سے زیادہ ان کے باپ شیخ مبارک کو علماء کے طبقہ سے ذاتی وجوھات کی بناء پر عناد پیدا ھو گیا تھا' وہ چاھتے تھے کہ اسکا انتقام لیں' مگر دربار کا ماحول اس کے لئے موافق نہ تھا' شہنشاہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور علماء سے بیحد عقیدت رکھتا تھا' اس کی عقیدت کی یہہ کیفیت تھی کہ ایک درباری عالم شیخ عبدالنبی نے سر دربار بادشاہ کے دامن پر عصا مارا' کیونکہ اس نے اپنی ھندو بیویوں کو خوش کرنے کے لئے بسنتی

کپڑے پہن لئے تھے - بادشاہ نے اس گستاخی پر شیخ عبدالنبی سے کچھ نہ کہا' صرف اپنی والدہ سے شکایت کی' اس نے اکبر کو سمجھا دیا کہ تاریخ میں اس کی شہرت رہے گی کہ یہ وہ بادشاہ تھا جسکے دامن پر ایک دینی عالم نے لکڑی ماری' ابوالفضل کے سامنے یہ حالات موجود تھے' لیکن ساتھ ھی اسنے اکبر کی اس کمزوری کا اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ وہ اقتدار کی اعلیٰ منزلوں تک پہونچنے کا خواھشمند ھے اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ دین و ایمان کی قربانی بھی کردے گا -

شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ذھین ھونے کے علاوہ اسلامی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے - انھوں نے اپنے منصوبہ کو بڑی دانشمندی کے ساتھ عملی شکل دینا شروع کیا - بادشاہ کے دل میں انھوں نے رفتہ رفتہ یہ بات بٹھلادی کہ شہنشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں کسی کو شرکت کا حق نہیں اور صرف حکمران ھی دینی و دنیوی امور میں ھادی و رھنما' بننے کا مستحق ھے' اکبر کے خیالات اور مشائخ چشت سے جن کی دعاؤں سے وہ سمجھتا تھا اس کے بہت سے کام نکلے ھیں اس کی عقیدتمندی کے پیش نظر' اسلام پر حملہ کرنے کے خاص طریقے ایجاد کرنا ضروری تھا' ابوالفضل نے یہ خدمت نہایت ھوشیاری اور کامیابی کے ساتھ انجام دی - دربار کے علماء نے بھی پستی اخلاق اور تعصب و تنگ نظری کا مظاھرہ کر کے ان کی کامیابی کے لئے سازگار ماحول پیدا کردیا' شیخ عبدالنبی کا

بادشاہ کے دامن پر لکڑی مارنے کا ذکر کیا جا چکا ھے' ایک دوسرے عالم مخدوم الملک کو دولت جمع کرنے کی شدید ہوس تھی' مکان کے صحن میں قبر نما گڑھے کھدوا کر انھوں نے اشرفیاں بھر دی تھیں' روایت ھے کہ وہ سال پورا ہونے سے قبل اپنی ساری دولت بیوی کے نام کردیتے تا کہ اس پر زکاۃ واجب نہ ہو' دوسرے سال کے ختم سے پہلے پھر اپنے نام منتقل کرلیتے' ان حالات میں ذاتی کردار پر حملے کر کے علماء و فقہاء کے وقار کو ختم کردینا نسبتاً ابوالفضل کیلئے آسان ہوگیا' شخصی وقارختم ہونے پر شریعت پر جسکے یہہ لوگ نمایندے سمجھے جاتے تھے' حملے کرنے میں زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ ابوالفضل اور اس کے ھم نوا اکبر کو نبی تو نہیں کہتے تھے اور شاید اس کے لئے وہ تیار بھی نہ ہوتا' لیکن ایسی خصوصیات اور اوصاف سے اس کی ذات کو متصف کیا جانے لگا کہ بالاخر اسکو خود یقین ہوگیا کہ وہ واقعی ایک نئے دین کی اشاعت کے لئے مامور ہوا ھے' اس کوصاحب معجزہ نہیں مگرصاحب کرامات کہا جاتا تھا' اس کے اقوال کو حدیث نہیں کہتے تھے مگر ان کو مرتبہ وھی دیا جاتا تھا' دینی معاملات میں اس کو صرف اجتہاد ھی کے اختیارات نہیں دیئے گئے بلکہ اس کا مرتبہ ھر مجتہد سے بلند کر دیا گیا' اسی قسم کی دوسری تفصیلات منتخب التواریخ میں خاص طور پر اور دوسری تاریخوں میں کہیں کہیں ملتی ھیں۔ اسلام پر سب سے شدید حملہ یہ کیا گیا کہ دینی زندگی سے رسالت کے تصور کو خارج کر دیا گیا۔ شریعت کو جسکی بنیاد یہی تصور تھا ''اسلام مجازی'' کہ

کر اس پر اعتراضات کی بوچھار شروع کر دی - ''حقیقی'' اور ''مجازی'' اسلام کے فرق کو اتنی اھمیت دی کہ ایک علحدہ دین کی تشکیل مکمل ھو گئی' جس مین خدا کے بعد اکبر کو جگہ دی گئی' مثلاً خدا کو سجدہ' عبودیت کیا جاتا تھا تو بادشاہ کے لئے سجدہ' تعظیمی ضروری قرار دیا گیا' بادشاہ کی تصویر پگڑی مین رکھنا طرہ' امتیاز سمجھا جانے لگا- اکبر کے نام کی وجہ سے السلام علیکم اور وعلیکم السلام کی جگہ اللہ اکبر اور جل جلا لہ کہا جانے لگا' رسالت سے قطع تعلق پر زور دینے کی غرض سے نئے دین کو توحید الہی یا دین الہی کا نام دیا گیا - یہ ضرور ھے کہ دین الہی بحیثیت دین کے فروغ نہ پا سکا اور اکبر کے بعد لوگ اسکو بھول گئے لیکن معاشرہ کے اندر اسکی وجہ سے جو رخنے پیدا ھو گئے انہوں نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی -

بعض دینی رھنماؤں نے اس خطرہ کا فوراً اندازہ لگا لیا' اور ملت کو اس سے بچانے کی کوشش شروع کر دی' پھلی مشہور شخصیت جس نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کی' شیخ عبدالحق محدث دھلوی کی تھی' انہوں نے اپنے انتھک قلم کو اس کے لئے وقف کر دیا' مثال کے طور پر مدارج النبوت (جلد اول صفحہ ۳) کے مقدمہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ھے' جھاں انہوں نے بتلایا ھے کہ زمانہ کے حالات کے پیش نظر بے خبروں اور غافلوں کو جناب رسالت مآب کے احوال و صفات قدسیہ بیان کرکے غفلت سے بیدار کرنا ضروری ھے' دوسری

مشہور شخصیت حضرت مجدد الف ثانی کی ہے' آپنے اپنے خلفا' اور مکتوبات کے ذریعہ احیا' شریعت کی کوشش کی' لیکن جس طرح ہر ٹوٹی ہوئی چیز کو دوبارہ بنانے مین وقت لگتا ہے اس اصلاحی تحریک کو بھی طویل راستہ طے کرنا پڑا۔

اسی تحریک کا ایک عظیم کارکن عالمگیر تھا' اگر اس کے کاندھوں پر شہنشاہی کا بار نہ ہوتا تو شاید اس تحریک کو آگے بڑھانے کے عمومی طریقے وہ بھی استعمال کرتا' لیکن بادشاہ ہونے کی حیثیت سے اس پر کچھ پابندیان تھی اور یہ امر یقیناً قابل تعریف ہے کہ ان پابندیون کے باجود اس نے اصلاحی کام کو دوسرے انداز سے کیا' چنانچہ بحیثیت حکمران کے اس پر اعتراضات نہین کئے جاسکتے' یعنی طاقت اور تلوار کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہین کی' ایک طرف تو حکمرانی کی شرائط کو ملحوظ رکھا اور دوسری طرف مصلح کا رول بھی ادا کرتا رہا۔

پروفیسر سرکار نے جزیہ کے دوبارہ نفاذ اور چند مندروں کے گرائے جانے کی مثالین دے کر عالمگیر کو ایک نا اہل حکمران اور انتہائی متعصب شخص ثابت کرنے کی کوشش کی ہے' تعجب ہے کہ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ یہ اس کی بنیادی پالیسی مین شامل نہ تھا کہ مندر گرائے جائین، کیون کہ آج بھی متعدد فرمان ملتے ھین جن کے ذریعہ اس نے مندروں کو جائدادین دیں۔ اس قسم کے فرامین کے ترجمے' جرنل آف پاکستان هسٹاریکل سوسائٹی مین شائع ہوئے ھین۔ ان مقالون کے مصنف

ایک ہندو فاضل' جنان چندر ہین۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عالمگیر نے جزیہ ضرور لگایا لیکن کم و بیش اسی ٹیکس ختم بھی کئے' جزیہ کی کسقدر غلط تصویر سورخون نے پیش کی ہے' یہ کھہ کر کہ یہ پول ٹیکس تھا' یعنی ہر غیر مسلم کو دینا پڑتا تھا' یہ سراسر غلط ہے' یہان تفصیل نہین دی جا سکتی' لیکن یہ بتلانا ضروری ہے کہ عورتین' چودہ برس تک کے سب لڑکے' اور لڑکیان اور غلام مستثنیٰ تھے۔ اندھے' اپاھج اور دماغی توازن نہ رکھنے والون سے اسی وقت لیا جاتا تھا جبکہ ان کے پاس کافی دولت ھوتی پجاری بھی ٹیکس نہیں دیتے تھے سوائے اس کے کہ ان کے پاس وقف وغیرہ کی زیادہ آمدنی ھوتی' اس کے علاوہ سرکاری ملازمین خواہ ان کا تعلق کسی محکمہ سے ہو جزیہ سے مستثنیٰ تھے' - اب اگر آپ غور کرین گے تو معلوم ہو گا کہ صرف وہ لوگ جزیہ دیتے تھے جو جوان العمر' تندرست اور کمانے والے تھے' اگر ہم ایک خاندان اوسطاً چھہ افراد پر مشتمل فرض کر لین تو غیرمسلم آبادی کا چھٹا حصہ ٹیکس ادا کرتا تھا' پھر اسمین اپاھج' بیمار' بے روزگار اور حکومت کے ملازمین کو نکال دیجئے تو مین سمجھتا ھون آٹھوان حصہ یعنی ہر سو مین سے بارہ' تیرہ آدمی جزیہ ادا کرتے تھے' پھر اس کی رقم بھی زیادہ نہ تھی' سب سے مالدار آدمی کو سوا تیرہ روپئے سالانہ دینے پڑتے تھے' اس کے بر خلاف زکاۃ کو دیکھئیے جو محفوظ آمدنی کی ڈھائی فیصد ھوتی تھی' ان بیانات سے آپ اندازہ لگا سکتے ھین کہ عالمگیر کی حکومت نے اپنی پالیسی کی بنیاد تعصب اور تنگ نظری پر نہین رکھی تھی بلکہ بعض اصول اور روایات تھین جن پر عمل

کرنا اس کے نزدیک ضروری تھا'

جیسا کہ مین نے ابتداء مین ذکر کیا ہے' وہ روایات اسلامی شریعت سے متعلق تھین جس کے بنیادی احکامات کو نافذ کرنا ضروری تھا' یہ نہ سمجھیے کہ ان احکامات کا نفاذ صرف غیر مسلموں ھی تک محدود تھا یا مسلمانوں کے ساتھہ کچھ ایسی مراعات کی جاتی تھین جو جائز نہ تھین' شریعت کے اکثر احکامات کا تعلق مسلمانوں ھی کی زندگی سے ھے' ان پر بھی احتساب کا محکمہ سختی سے عمل کرتا تھا' حقیقت یہ ھے کہ تاریخ کے طالب علم کو عالمگیر کی ان اصلاحات کا جو اس کی تنگ نظری کے ثبوت مین پیش کی جاتی ھین' بہت غور سے مطالعہ کرنا چاھیئے اور یہ دیکھنا چاھیئے کہ ان کا پس منظر کیا ھے اور اس شہنشاہ نے ان کو کیون نافذ کیا' یہ ایک جاھلانہ اعتراض ھے کہ آس تعصب کی وجہ یہ تھی کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا' یہ بھی صحیح نہین کہ وہ اپنی اصلاحات کے رد عمل کا احساس نہیں رکھتا تھا' ان تمام مسائل پر غور کرنے اور اس کی اصلاحات کی حقیقت سمجھنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ معاشرہ میں جو تبدیلیان اکبر کے عہد مین واقع ھوئی تھیں اور جن کے اثرات زندگی کے بعض پہلووں پر مستقل طور پر قائم ھو گئے تھے' وہ ان کی اصلاح کرنا چاھتا تھا۔

سوسا ئٹی اور اس کے ساتھہ نظم حکومت کا ایک خاص تصور اس کے ذھن میں تھا جس کی بنیاد شریعت اسلام کے اصول

تھے۔ اسی تصور کو وہ عملی شکل دینا چاہتا تھا۔ اس معاشرہ
مین جس شخصیت کا تصور اس کے ذہن مین تھا مسلمانون کی ایک
علٰحدہ شخصیت تھی اس کو تہذیب و تمدن کی ترقی مین بہت اہم
کردار ادا کرنا تھا اسکو یقین تھا کہ اس کی اصلاحات مسلمانون کو
اپنا کردار ادا کرنے کے قابل بنانے کے لئے ضروری ہین، غیر مسلمون
کا بھی اس معاشرہ متعین مقام تھا، عالمگیر جانتا تھا کہ
اس ترتیب اور دونوں قوموں کی حیثیت مین ذرا بھی فرق آیا
تو معاشرہ کی عمارت متزلزل ہونے لگے گی، مورخین نے اس کی
اصلاحات کو تعصب کا نتیجہ کہہ کر تاریخ کے اس باب کو
مسخ کر دیا ہے، اصلاحات کی نظر مین ہندو اور مسلم کا
فرق بنیادی حیثیت نہیں رکھتا تھا، مثلاً سماجی اصلاح کے
سلسلہ میں ستی کے خلاف حکم دینا ایک اہم اقدام تھا، راہداری
کو جو کھانے پینے کی چیزوں پر دس فیصد ٹیکس تھا، اس نے ختم
کیا، سوچئے اسکا فائدہ ہندؤں کو زیادہ پہونچا، یا مسلمانوں کو۔
اور بھی اسی قسم کے محصولات جن کو عام طور پر ابواب
کہتے تھے معاف کر دیئے گئے، یہی نہیں بلکہ بعض وہ ٹیکس
بھی بند کئے جو خالصتاً ہندؤں سے وصول کئے جاتے تھے، مثلاً
ہر ہندو مقدس مقامات پر نہانے کا سوا چھہ روپیہ معاوضہ ادا
کرتا تھا، یہہ ختم کر دیا گیا، یہہ ذہن میں رکھئے کہ یہہ
رقم جزیہ کی اس رقم سے دوگنی تھی جو غریب ہندو ادا کرتا
تھا اور یہہ ہر اس شخص پر لگایا جاتا تھا جو کسی مقدس
گھاٹ پر نہانا چاہتا تھا، اسی طرح جس ہندو کی لاش کو گنگا
میں پھینکنے کے لئے لے جایا جاتا، اس پر ٹیکس لگتا تھا، جو

اس نے بند کیا، اس قسم کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ھیں، کیا تعصب اور تفریق کی بنیاد پر قائم ھونے والی کوئی حکومت یہ اقدام کر سکتی تھی اور اسقدر عظیم مالی نقصان برداشت کر سکتی تھی ؟ بھنگ کی کاشت کو سارے ملک میں بند کر دینا، طوائفوں کو مجبور کرنا کہ شادیاں کریں، شراب نوشی، جوے اور زنا کو قانون کی نظر میں جرم قرار دیدینا، ۔ کسی شخصی یا ذاتی تعصب کی بناء پر یہہ اصلاحات جاری نہیں کی جا سکتی تھیں ۔ دربار سے ناچ گانے کو جلا وطن کرنا، بادشاہ کو تولنے کی رسم بند کرنا اور نوروز کے جشن کو ختم کرنا، یہ سارے اقدامات ایک ھی مقصد کے حصول کے لئے تھے، اور شاھنشاہ کی نظر میں اسی قدر ضروری تھے جتنا کہ اھم سے اھم اصلاحی اقدام ھو سکتا تھا ۔ اس مین شک نہیں کہ بعض اوقات وہ حد سے بڑھ جاتا تھا اور تنگ نظر فقہا، کی سفارشات کو قبول کرتے ھوئے ایسے احکام جاری کر دیتا جن کو دیکھہ کر حیرت ھوتی ھے مثلاً سرمد کو ننگا رھنے پر قتل کرادینا، حالانکہ اگر وہ اپنے قابل اعتراض رویہ کو تبدیل کرنے کے لۂ تیار نہ تھے تو ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگا کر ان کو سوسائٹی سے علحدہ رکھا جا سکتا تھا ۔

عالمگیر نے صرف احکامات جاری کرنے ھی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لوگوں کی واقفیت اور فقہا اور قضاۃ کی سہولت کے لئے فتاویٰ عالمگیری تالیف کرائی جس کو قانون کی دنیا میں اھم حیثیت حاصل رھی ھے ۔ بعض مورخین نے اس پر بہت زور دیا ھے کہ عالمگیر اپنی اصلاحات نافذ کرنے میں صرف ایک حد تک کامیاب ھوا، یہہ

صحیح ہے' لیکن اس کا ذمہ دار اسکو نہیں کہا جا سکتا' ہر مصلح
کے ساتھہ یہی ہوتا ہے' ہمکو دیکھنا یہہ ہے کہ اسکی ان
اصلاحات کا مستقبل کی تاریخ پر کیا اثر ہوا' دین الہی کے
موجدون نے بر صغیر میں ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی
تھی جس میں ہندو اور مسلمان' دونوں قومیں اپنی شخصیتوں
کی تفریق مٹا کر ایک ہی دین کے پابند ہو جائیں' اس میں
ظاہر ہے ہندوؤں کو اپنا مذہب چھوڑنا پڑتا اور مسلمانوں کو
اسلام ترک کرنا پڑتا' اس میں کامیابی کے امکانات اس لئے اور
بھی زیادہ ہو جاتے کہ دارا شکوہ اگر تخت کا مالک بن جاتا
تو یقیناً وہ دوسرا اکبر ثابت ہوتا' دارا کے دور حکومت میں
دین الہی کا احیا' لازمی تھا' چاہے اسکو نام کچھہ بھی دیا جاتا۔
اگر آپ دارا کے مذہبی عقائد کا' جو اس کی تصانیف سے ظاہر
ہوجاتے ہیں' بہ غور مطالعہ کریں تو اسی نتیجے پر پہونچینگے
کہ اس کی کوشش سے یہاں کے اکثر لوگ نہ ہندو رہتے نہ
مسلمان' یہی وہ چیز تھی جو مسلمانوں کے لئے سم قاتل ثابت
ہوتی۔ اسی کو عالمگیر نے تخت حاصل کرکے اور اپنی اصلاحات
جاری کر کے روک دیا' یہ ہی اسکا وہ کارنامہ ہے جو تہذیب و
تمدن کی عمارت میں مستقل مقام رکھتا ہے اور اسی کارنامہ کی
بدولت وہ اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے حالات صحیح
پس منظر میں پیش کریں' اس کی تاریخ پر بہت کچھہ لکھا
گیا ہے' لیکن ان تصانیف نے اسکی شخصیت کو روشن کرنے
کے بجاے مسخ کر دیا ہے' ہمارا فرض ہے کہ اس کی صحیح
تصویر مکمل کرنے کی طرف قدم اٹھائین' اس سلسلہ میں میری

رانے ہے وہ سب کے سب بھی منزل پہ ہونی چاہئے نہ اس کے خطوط جن کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے، جمع کر کے مرتب اور شایع کئے جائیں۔ ہم کو امید رکھنا چاہئے کہ کوئی ادارہ اس اہم خدمت کو اپنے ذمہ لے گا۔

آخر میں، مین آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خاص طور پر اپنے محترم دوست جناب ممتاز حسن صاحب کا جن کی علم دوستی اور "سخن پروری" کی شہادت اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود اس اجلاس میں شرکت فرما کر، کارکنان دائرہ کی ہمت افزائی کی۔

اساتذہ عالمگیر

از مفتی انتظام اللہ شہابی

شاہجہانی عہد میں علم و فضل کی بے حد ترقی تھی اس کے زمانہ میں آگرہ و دلی علمی مرکز تھے ہی مگر اقطاع ہند کے بعض شہروں اور قصبوں میں بھی کثرت سے درسگاہیں تھیں شاہجہاں اودھ کے علاقہ کو "پورب شیراز ماست" کہتا تھا۔ جب اورنگ زیب عالمگیر کی پیدائش ہوئی تو ان کی تعلیم و تربیت اس عہد کے منتخب علماء کے سپرد کی گئی۔ جن کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔

مولینا عبداللطیف سلطان پوری مولینا ہاشم گیلانی علامی سعد اللہ خاں ملا موہن بہاری مولینا سید محمد قنوجی ملا شیخ احمد عرف ملا جیون امیٹھوی شیخ عبدالقوی دانشمند خاں ملا ابوالواعظ ہرگامی۔

اب ہم ان علمائے گرام کے حالات پیش کرتے ہیں۔

مولینا عبداللطیف سلطانپوری

نقد و تحریر اور علمی تحقیق میں یگانہ تھے۔ (بزم تیموریہ ص ۲۱۶)۔ در معقولات و منقولات جہارتے تمام داشت۔ (تذکرہ علمائے ہند۔) دارالشکوہ اور اورنگ زیب نے ان سے تلمذ اختیار کیا آخر میں بصارت جاتی رہی تھی شاہجہاں نے ان کو خطابات عطا کئے۔ وطن میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۰۲۶ھ میں انتقال ہوا۔ تاریخ

یہ ہے۔

آفتاب علم را آمد کسوف (مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۲۵)

مولینا ہاشم گیلانی

میر محمد ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی است، مدت دوازدہ سال در حرمین شریفین بودہ منقولات را از شیخ محمد عربی محدث و شیخ عبدالرحیم حسانی ملا علی نبیرہ ملا عصام الدین مشہور و معقولات را از میر نصیر الدین حسین پسر زادہ میر غیاث الدین منصور و مرزا ابراہیم ہمدانی فرا گرفتہ بہندوستان آمد، او طب و ریاضی نزد سر آمد اطبا، حکیم علی گیلانی ورزیدہ چندے در احمد آباد گجرات بتدریس مشتغل بود، چوں دانائی او در فنون فضائل خصوصاً طب بعرض اقدس رسید، حکم شد کہ ہماں بلدہ بخدمت صدارت و طبابت بپردازد پس از انقضائے مدتے ملازم عبودیت سدہ سنیہ گشتہ بامر خاقانی شرف تعلیم اختر برج سعادت بادشاہ زادہ محمد اورنگ زیب بہادر دریافت و اکنوں در ملازمت آں والا گوہر کامیاب است بہ تفسیر بیضاوی حاشیہ نگاشتہ (عبدالحمید جلد اول حصہ دوم ص ۶ - ۲۵)

شیخ احمد عرف مُلّا جیون امیٹھوی

امیٹھی مضافات لکھنؤ سے ایک مردم خیز بستی تھی حضرت بندگی نظام الدین عثمانی کی وجہ سے اس قصبہ کی بہت شہرت ہے، ملا جیون کا مسکن و مولد یہی قریہ ہے آپ کے والد کا نام ملا ابو سعید تھا جو مخدوم شیخ نثار الحق کی اولاد سے تھے جن کا سلسلہ نسب عبداللہ علمبردار سے ملتا ہے۔ ملا ۲۵ شعبان ۱۰۴۷ھ میں پیدا ہوئے

ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی تکمیل حضرت شیخ محمد صادق ستر کھی سے کی وہ
قطب وقت تھے سلسلۂ چشتیہ میں آپ نے سند اجازت لی ۲۲ سال میں فراغت حاصل
کرلی، آپ کے ماموں سید عبد اللہ امیٹھوی معروف بہ نواب عزت خاں اورنگزیب
عالمگیر کے عہد میں میر اتش تھے چنانچہ آپ بعمر چالیس سال دلی پہونچے اپنے ماموں
کے ذریعہ عالمگیر سے ملے، انہوں نے ان کو درباری علماء میں شامل کر لیا، ان سے
استفادہ بھی کیا اسی بنا پر ان کو استاد الملک کا خطاب دیا اور ایک لاکھ ساٹھ
ہزار کی جاگیر مدد معاش کے لئے عطا کی۔ ۵۵ برس کی عمر تھی کہ آپ دہلی سے دکن
گئے سورت آئے، یہاں سے زیارت حرمین شریفین کے لئے حجاز گئے ۵ برس
مقیم رہے۔ پھر یہاں سے واپس دکن ہوئے چھ سال تک لشکر معلی عالمگیری میں مقیم
رہے بادشاہ دین پناہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ۱۱۱۲ھ میں جب کہ آپ کی عمر ۶۶
سال کی تھی بادشاہ سے اجازت لے کر حرمین شریفین پہونچے دو سال قیام کیا۔
ایک حج بدل والد کے لئے دوسرا والدہ کے لئے ادا کر کے پھر دکن لوٹ آئے ۱۱۱۶ھ
میں وطن امیٹھی آ گئے یہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ محمد معظم کے
پہلے سنہ جلوس میں طلباء کو ہمراہ لے کر دہلی آئے اس وقت عمر ملا صاحب کی ۷۲
سال کی تھی۔ محمد معظم دکن سے واپس اجمیر آتے میں ملا صاحب نے ان سے ملاقات
کی اور ان کے ہمراہ لاہور گئے اور کچھ عرصہ وہیں مقیم رہے، محمد معظم شاہ عالم اول
نے انتقال کیا تو یہ دہلی آ گئے فرخ سیر کے عہد تک مقیم رہے۔

دلی میں بتاریخ ہفتم ماہ ذیقعدہ ۱۱۳۰ھ بروز دوشنبہ انتقال فرمایا!
یہاں سے نعش امیٹھی لے جا کر ۴ محرم ۱۱۳۱ھ کو دفن کی گئی۔

قطعۂ تاریخ

چو در علم آں مولائے اعظم ــــــ با احمد عرف جیون شد معظم

جہاں را روشنی زاں شیخ دیں بود　　بعلم ظاہر و باطن مسلم
چو رحلت کرد در ذیقعدہ　　بوصلِ دوست خود گشتہ مکرم
بتاریخش خرد دادا بگوشم　　نزاد کامل وفیاض عالم ۱۱۳۰ھ

(الناظر یکم اگست ۱۹۱۰ء ص ۴۵)

ملا صاحب نے ۱۳ برس کی عمر سے تصنیفی سلسلہ شروع کر دیا تھا، آداب احمدی و سیر و سلوک اور ۱۶ سال کی عمر میں تفسیر احمدی لکھی، ایک مثنوی بطرز مثنوی مولینا روم پچیس ہزار اشعار چھ دفتر میں ہے، لکھی۔ ایک دیوان پانچ ہزار اشعار کا مجموعہ عربی زبان میں، ایک قصیدہ ۲۲۰ اشعار کا بروزن قصیدہ بردہ تصنیف کیا۔ مدینہ منورہ کے قیام میں نور الانوار شرح منار لکھی اور مزار اقدس سرورِ کونین کے حضور پیش کی رسالہ تصوف، مناقب الاولیا، یہ آپ کی یادگار سے ہیں۔ نور الانوار اور تفسیر احمدی بہت مقبول ہوئیں۔

ملا موہن بہاری

محی الدین نام تھا نو سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا شیخ شاہ حیدر نبیرۂ علامہ شیخ وجیہہ الدین گجراتی سے شرف بیعت کیا شاہجہاں کے دربار سے متعلق ہو گئے عالمگیر کی تعلیم کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ بعمر ۸۴ سال ۱۰۶۸ھ میں داصل بحق ہوئے۔

مولانا سید محمد قنوجی

ادب و ریاضی کے ماہر تھے احیاء العلوم عالمگیر نے ان سے پڑھی۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شریک رہے ۱۱۰۱ھ میں انتقال ہوا۔ (بزم تیموریہ ۲۲۴)

شیخ عبدالقوی برہان پوری

اورنگ زیب نے ان سے بھی استفادہ علمی کیا، برسر حکومت ہوئے تو استاد کو ہزار پانصدی کا منصب عطا کیا اور اعتماد خاں خطاب دیا۔ سرمد کے قتل میں انکی سعی کو دخل ہے۔ یہ قتل ہوئے، تفصیل بزم تیموریہ میں دیکھئے۔

ملا شفیعائی یزدی

دانشمند خاں خطاب تھا۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے مناظرے کئے زمرہ ملازمین شاہجہاں سے تھے۔ عالمگیر نے خاص کتب ان سے پڑھیں۔ جب فرمانروا ہوئے ان کو پنج ہزاری منصب عطا کیا۔ ۱۰۸۱ھ میں انتقال فرمایا (ماثرالامرا جلد ۲ ص ۳۲ و بزم تیموریہ۔

علامی سعداللہ خاں

علامی چنیوٹ کے ایک کاشتکار امیر بخش کے صاجزادے تھے غربت میں علوم وفنوں کی تحصیل کی صاحب فضل و کمال تھے موسوی خاں صدر کل کی سفارش سے دربار شاہجہانی سے منسلک ہوگئے اپنی اعلیٰ قابلیت سے ترقی کرتے ہوئے ہفت ہزاری منصب پر سرفراز ہوئے علامی و فہامی کا خطاب پایا۔ وزارت کے منصب پر سرفراز رہے۔ ان سے بھی عالمگیر نے استفادہ علمی کیا۔ (عمل صالح ج ۲ ص ۳۲۶)

ملا ابوالواعظ ہرگامی

ملا ابوالواعظ ابن قاضی صدرالدین ہرگامی کے متعلق مولانا فضل امام تراجم فضلاء میں لکھتے ہیں کہ " از اساطین علماء و ارکین فضلاء بود در جمیع علوم دستگاہے بلند و قدرتے تمام داشتہ… ملا از استادانِ عالمگیر بادشاہ اند و در تالیف فتاوائے عالمگیری شرکت داشتند" (تراجم فضلاء ص ۱۲)

مُغلوں کی جنگِ جانشینی کا مذہبی پہلو ۱۶۵۸ء۔۱۶۵۷ء

از۔ ڈاکٹر افتخار احمد سایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ترجمہ ثناء الحق ایم اے

یہ اُن انتہائی خوں ریز جنگوں میں سے ایک تھی جو تاریخ اسلام کے کسی دور میں جانشینی کے مسئلہ پر لڑی گئیں۔ اس موقع پر "بادشاہت قرابت داری سے نا آشنا ہوتی ہے،، کا مقولہ پوری طرح صادق آیا۔ اور خون پانی سے زیادہ کثیف ہوتا ہے" کا اصول کلیۃً غلط ثابت ہو گیا اس تنازعہ کے دوران جس قدر اتلافِ جان ہوا اس کے بارے میں اخبار بہت مختلف اور متضاد ہیں۔ پھر بھی جس تعداد پر معتبر لوگوں کا اتفاق ہے وہ پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس لڑائی میں جس چیز نے درندگی کا بڑا عنصر پیدا کر دیا وہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے مذہبی عقائد کا اختلاف تھا۔ جس نے اس تنازعہ کو جو پہلے ہی سے گہرے ذاتی اختلافات کی بنا پر کافی شدت اختیار کر چکا تھا اور بھی خونی اور دہشت انگیز بنا دیا۔ اہل سنت و جماعت جو ہندی مسلمانوں میں اکثریت رکھتے تھے ان کی کثیر تعداد نے داراشکوہ کے معاملہ کو بگاڑنے اور اورنگ زیب کو تقویت پہونچانے میں بڑا کردار ادا کیا۔

زیر تذکرہ لڑائی میں اس لئے اور بھی شدت پیدا ہو گئی کہ اسلام نے کبھی بھی بادشاہی نظام کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے اس میں جانشینی کے لئے کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا۔ خلافت

کے نئے جانشینی کے مسئلہ پر انتخاب کا نظریہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں صرف چند یوم تک جاری رہا۔ امویوں نے سب سے پہلے اس کو رد کیا اور مغلوں نے اس پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ انہوں نے اس کو نظریہ کی حد تک بھی قایم نہ رکھ کر بالکل ترک کر دیا۔ مغل اپنے ذاتی اجتہاد سے اس اُصول پر کاربند تھے کہ تخت کا وارث سب سے بڑا بیٹا ہو۔ بنابریں اس سے انحراف کرنا اور بھی آسان ہوگیا۔ اس تنازعہ کے فریقوں نے خیال کیا کہ جانشینی کی جنگ لڑکر وہ کسی مذہبی اصول کے خلاف ورزی نہیں کررہے ہیں اسی لئے ایک دوسرے کے خلاف جنگ و پیکار کے لئے ان کی ہمتیں اور بھی بڑھ گئیں۔

داراشکوہ اور اورنگ زیب کے مابین مذہبی اختلافات

یہ ممکن نہیں کہ داراشکوہ کا کوئی حامی یا اس کی جانب سے معذرت خواہی کرنے والا شخص اس بات سے انکار کرے کہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے مابین مذہبی اختلافات نہیں تھے۔ دارا کی شروع کی دو کتابوں سفینۃ الاولیا (۱۶۳۹ء) اور سکینۃ الاولیا (۴۲ ۱۶ء) کی بنیاد پر جو اس کے اوائل شباب کی تصنیفات تھیں یہ بات سمجھی جاتی تھی کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور صوفیہ اور اولیا واللہ کا پرجوش مقلد اور پیروکار ہے۔ اس کی تیسری کتاب "طریقۃ الحقیقت" نے یہ بات واضح کردی کہ وحدانیت کے عقیدے کے خلاف وہ ہمہ اوست کے نظریہ کا حامی ہوگیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت "حسنات العارفین" (۱۶۵۲ء) وہ کتاب تھی جس سے واشگاف طریقہ پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ توحید وجودی کے عقیدے کو سینہ سے لگائے ہوئے ہے۔ اس کے اس اعلان نے کہ وہ فنافی اللہ کے مرتبے پر فائز ہوچکا ہے لہذا اس کو نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے سنی مصاحبوں میں کافی اشتعال پیدا کر دیا۔ سرمد سے جو ایک مست فقیر، اور آرمینیا سے آیا ہوا ایک وارستہ مزاج یہودی تھا اور ہمیشہ برہنہ رہتا تھا اس کی دوستی نے راسخ العقیدہ

مسلمانوں میں نفرت اور غم وغصہ کا جذبہ عام کر دیا۔ اس کے رام چندر ثانی بننے کی شدید خواہش سے جو اس کی تصنیف "یوگ وسشتا" کے مقدمہ سے ظاہر ہوتی تھی نیز اس کی اس انگوٹھی سے جس پر ہندی میں لفظ "پربھو" کندہ تھا اس کے ہندو مصاحبین کچھ مطمئن ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں لیکن اہل سنت وجماعت کے لئے یقیناً یہ بات پسند نہیں تھی۔ ڈانخالیکہ تخت نشینی کے معاملہ میں ان کی حیثیت ایک اہم فریق کی سی تھی۔ اس کی دو کتابیں جن کے نام "مجمع البحرین اور سر اکبر" تھے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اشتعال انگیز تھیں کیونکہ ان کتابوں میں اس نے دین اسلام کو جو وحدانیت کا مذہب ہے ہندو مت کی سطح پر پہونچا دیا تھا جو ایک ایسا مذہب ہے جس میں بت پرستی اساسی دین ہے۔ داراشکوہ محض ان علمی مباحث میں ہی مشغول نہیں تھا بلکہ اپنے مختلف افعال واعمال کے ذریعہ ہندوؤں کو خوش کرنے کی سعی وجہد میں لگا ہوا تھا۔ تاریخ اسلام میں اس قسم کی مثال جب کہ کسی مسلمان نے بت پرستوں کے کسی معبد کو کوئی نذر پیش کی ہو نہیں ملتی۔ لیکن داراشکوہ نے متھرا کے مقام پر واقع کیشو رائے کے خوبصورت مندر میں پتھر کی باڑھ لگوائی تھی۔ ہندو زائرین پر جو ٹیکس شاہجہاں نے عائد کیا تھا وہ داراشکوہ کے مسلسل اصرار پر ختم کر دیا گیا تھا۔ مسلمان امراء اکثر چھوٹے پائچوں کا پائجامہ پہنتے تھے داراشکوہ اس لباس کا مذاق اڑاتا اور علانیہ ان لوگوں سے اظہار نفرت کرتا تھا۔ جو یہ لباس زیب تن کرتے تھے۔[1]

غرض داراشکوہ نے عجیب طرح کی شہرت حاصل کی تھی وہ حقیقتاً ایک مجموعہ اضداد شخص سمجھا جانے لگا۔ جو مسلمانوں میں رہ کر مسلمان، ہندوؤں میں ہندو اعیسائیوں میں عیسائی تھا۔ اس کے علمی مباحث اور ہندو نواز پالیسی کی وجہ سے سچے مسلمان

---

[1] وقائع عالمگیری۔ عاقل خاں رازی۔ مرتبہ عبداللہ چغتائی لاہور ۱۹۳۶ء ص ۷۸

اس کے مخالف ہو گئے جس کے سبب توازن قایم رکھنے کی غرض سے اس نے ہندوؤں کے ساتھ دوستی کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کر دی جو اول الذکر طبقہ کے دل میں اس کی طرف سے اور بھی نفرت پیدا کرنے کا موجب بنی۔

اس کے برعکس اسلام کے سچے اصولوں کے ساتھ اورنگ زیب کی وابستگی کے بارے میں کبھی بھی کسی شخص نے شبہہ کا اظہار نہیں کیا وہ ایک سنی مسلمان تھا اور اس فقہ پر سختی سے عامل تھا جس کے موسس حضرت امام ابو حنیفہؒ تھے اسلام کے ظاہری اصولوں کو ماننے میں وہ شدت کا مظاہرہ کرتا وہ تمام راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لئے ایک نا قابلِ تقلید امر تھا۔ داراشکوہ سے اس کے سخت مذہبی اختلافات تھے اور وہ کھلم کھلا اس کو ان القاب سے نوازتا تھا۔

" ملحد بے دین، دشمن دین مبین، رنگ از مسلمانی نہ داشتہ "

ایک ایسے دور میں جب مذہب اقدارِ حیات میں اہم درجہ رکھتا تھا مسلمانوں کے دینی جذبات سے اپیل کرنا کسی طرح رائیگاں نہیں جا سکتا۔

ستمبر ۱۶۵۷ء میں جب شاہجہاں بستر علالت پر پڑا تو داراشکوہ نے شہنشاہ کی جانب سے یہ نادر شاہی حکم جاری کیا کہ سلطنت بیجاپور سے جملہ اختلافات بلا تاخیر و توقف ختم کر دئے جائیں اور تمام شاہی افواج فوراً آگرہ واپس ہو جائیں۔ یہ حکم دکن میں اورنگ زیب کی قوت اور اس کے وقار پر ایک تازیانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس حکم نے بالواسطہ اس افواہ کی بھی توثیق کر دی کہ شاہجہاں حقیقتاً فوت ہو چکا ہے۔ اور دارا نے شاہی افواج کو فوری واپسی کا حکم محض اس لئے دیا ہے کہ وہ اپنی ذاتی قوت میں اضافہ کر سکے۔ ان باتوں نے پیش نظر اورنگ زیب نے مذہب کا واسطہ دے کر شاہی افواج سے درخواست کی وہ واپس ہو کر دارا جیسے ملحد اور دین کی قوت میں اضافہ کا سبب نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز کے بیس مسلمان افسروں نے

شاہی افواج کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب سے تعلق قایم کر لیا[1]۔ اس موقع پر کسی ہندو افسر نے شاہ پسندوں کا ساتھ نہیں چھوڑا یہی نہیں بلکہ بیکانیر کے راؤ کرن نے جو دکن میں شہزادہ اورنگ زیب کی افواج کا ایک اہم رکن تھا اور جو داراشکوہ کے ان استبدادی احکام سے بذاتِ خود متاثر بھی نہیں ہو رہا تھا اپنے آقا کی رفاقت ترک کر دی۔ اور براہِ راست آگرہ پہونچ کر داراشکوہ سے مل گیا۔ یہ عدول حکمی کی ایک بیّن مثال تھی۔ چنانچہ عالمگیر نامہ اس کے اس غلط طرزِ عمل پر سب و شتم سے پُر ہے[2]۔

جب تخت نشینی کے لئے جنگ قطعاً ناگزیر ہو گئی تو اورنگ زیب نے محمد داراشکوہ[3] کے خلاف اس دور کے علماء اور مشائخ سے مذہب کے نام پر اپیل کی۔ اپنے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی۔ علماء جو وارثین پیغمبر سمجھے جاتے ہیں فی الجملہ اورنگ زیب کے طرفدار ہو گئے۔ اورنگ زیب کے مصاحبوں اور ساتھیوں کا جائزہ لینے سے یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ اس کے طرفداروں میں اکثریت اہل سنت وجماعت کی تھی، وہ یا تو سنی علماء تھے یا سنی امراء۔ اس کے ساتھیوں میں ہندو اقلِ قلیل کا درجہ رکھتے تھے۔ پھر بھی اس کی فوج میں مشہور اور آزمودہ کار جنرل مفقود تھے۔ اس کا لشکر درحقیقت غیر معروف اور اوسط درجہ کے افراد پر مشتمل تھا۔ اگرچہ خود خود اورنگ زیب اور مراد کو مستثنیات میں شمار کیا جاتا ہے۔

داراشکوہ کی فوج کے انتہائی مشہور اور آزمودہ کار سپاہیوں سے اس طرح کے لوگوں کی زور آزمائیاں اس امر پر دال ہے کہ یہ فی الحقیقت اس کے ہمراہیوں کا جوش اور جذبہ ہی تھا جس نے ان کی فطری کمزوری کو دبا لیا اور ان کو داراشکوہ کی فوج کے ان تجربہ کار

---

[1] تاریخ شاہجہان از محمد صادق۔ برٹش میوزم۔ قلمی نسخہ اورنٹیل ۱۶۷۱ء الف ۹۶ لے۔ ایک اہم ماخذ جس تک ہنوز کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ [2] (عالمگیر نامہ) ص ۵۹۹ [3] تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے "شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ" از ڈاکٹر افتخار احمد غوری۔ لاہور ۱۹۶۲ء۔

سپاہیوں کے مدمقابل لاکھڑا کیا۔ جن میں راؤ ستار سال ہاڑا اور رستم خاں فیروز جنگ جیسے جنرل موجود تھے۔

جنگ دھرمت میں خفیہ سازش۔ اپریل ۱۶۵۸ء

اس جنگ میں دونوں فریقوں (یعنی اورنگ زیب اور داراشکوہ) کے مسلمان سپاہیوں کو نہایت خفیف نقصانات پہونچے۔ البتہ دارا کے طرفدار ہندوؤں کو نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا۔ دارا کے ساتھیوں قاسم خاں اور نصیری خاں کے طرز عمل نے یہ بات واضح کردی کہ ان کے قلوب اورنگ زیب کے ساتھ تھے۔ اگرچہ جسمانی طور پر وہ دارا کی جانب سے شریک جنگ تھے۔ دارا کی طرف محض ایک مسلمان افسر ایسا تھا جو اس جنگ میں بہادری سے لڑا اور وہ تھا اس دور کا مشہور شیعہ افسر افتخار خاں۔[۱]

دھرمت کی فتح کے فوراً بعد اورنگ زیب نے اس مقام پر ایک مسجد، ایک سرائے، ایک مینار تعمیر کئے۔

جنگ ساموگڈھ مئی ۱۶۵۸ء

داراشکوہ کے مسلمان ہمراہی اس کو اکثر غلط مشورہ دیتے تھے جس کا فائدہ اورنگ زیب کو پہنچتا تھا۔ مثلاً شائستہ خاں کا شاہجہاں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ خود ساموگڈھ کی لڑائی میں نہ جائے درحقیقت اس غرض سے تھا کہ اس سے انجام کار اورنگ زیب کو فائدہ ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ ساموگڈھ کی جنگ میں کوئی خفیہ سازش نہیں ہوئی۔ دونوں فریقوں کی جانب ایسے مضبوط کردار کے لوگ شامل تھے جن کو توڑا جاسکتا تھا مگر موڑا نہیں جاسکتا تھا۔ دارا کے طرفدار راجپوت اور اس کے شیعہ مصاحبین نے اپنے ہیرو کو کامیاب بنانے میں زمین و آسمان ایک کر دیا۔ لیکن اورنگ زیب اور مراد کی اعلیٰ فوجی قیادت کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

اس جنگ کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ اورنگ زیب کے تخت طاؤس پر قدم رکھتے ہی سنی عقیدۂ اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں۔

---

[۱] تذکرۃ الامرا، برٹش میوزیم قلمی نسخہ ۱۶۷۰۴ الف ۱۱

سید سخاوت علی خسرو

اورنگ زیب کی شخصیت

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت کے ساتھ مختصر وقت میں کوئی انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بادشاہ جس نے تقریباً نوے برس عمر پائی، پیدائش سے موت تک سپاہیانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کے علاوہ نصف صدی سے زیادہ کے دور حکومت میں اتنے واقعات ہوئے کہ ہر ایک کے اسباب و نتائج پر غور کیا جائے اور ان سے بادشاہ کی شخصیت کا اندازہ لگایا جائے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں خوش قسمتی سے اس دور میں مورخین اور دیگر سفراء اس قدر ہوئے کہ ہر موقع کی تفصیل موجود ہے جن واقعات اور حالات سے دشمنوں نے برائی کے پہلو نکالے اور عالمگیر کی شخصیت کو بدنما کرنا چاہا انہیں سے اس کی بریت ہو سکتی ہے۔

ایک بچہ جو باپ کے ایام جلاوطنی میں پیدا ہوتا ہے اتنا زبردست عالم باعمل، منشی، سپاہی، سیاست داں، ادیب اور دیانت دار ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں تاریخ میں دوسرا کوئی نہیں ملتا۔

جو لوگ اورنگ زیب پر الزامات لگاتے ہیں وہ نہیں سوچتے کہ جب وہ پیدا ہوا تو اس کا باپ خرم، جہانگیر کے عتاب سے تھا۔ اس دور میں شہزادہ جلاوطنی کی حالت میں پلا بڑھا بھی اس نے وہ کمال حاصل کیا کہ تقریباً دس ہزار خطوط فارسی کی انشاء سے مالا مال ہیں اور ان میں نہ صرف زبان کی چاشنی پائی جاتی ہے بلکہ وہ گوناگوں معلومات کا خزانہ ہیں اور آئینِ جہانداری

اخلاق اور اسلامی تعلیمات کا بحر ذخار ہیں۔

اس کے علاوہ بچپن ہی میں اس شہزادہ کو باپ کے عتاب سے دوچار ہونا پڑا اس کے باوجود کسی موقع پر اس نے ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اگرچہ شفقت پدری سے محروم تھا تاہم خود بہ نفسِ نفیس باپ کی خاطر اور دلجوئی میں کوئی کوتاہی نہیں ہونے دی۔

تخت نشینی کی جنگ کے علاوہ کسی موقع پر اس کے ظلم و ستم کا ثبوت نہیں ملتا بچپن میں باپ کی طرف سے محبت نہ ملی بھائیوں نے ہمیشہ ان کو فریب دیا لیکن ان کے کردار میں کہیں دھوکہ فریب نظر نہیں آتے۔

اس دور میں ہمیشہ دبی زبان سے اس نے یہی آواز نکالی

گر تو اے گل گوش بر آواز بلبل می کنی

کار مشکل می شود بر بے زبانانِ چمن

بچپن کی مظلومی میں شہزادے نے اپنے گرد وپیش پر کافی غور وخوض کیا تو پتہ چلا کہ لوگ عیش و عشرت میں مشغول ہیں اکبر اور جہانگیر کے عہد سے ہندوانی طریقہ اختیار کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور داراشاہزادہ نے تو حد ہی کر دی جوگیوں اور سادھوؤں کے پھندے میں پھنس کر کرشن اور رامچندر کی طرح اوتار بننے کا ارادہ فرمانے لگے عالمگیر کے سینے میں ایک مسلمان کا رسول اللہؐ سے محبت کرنے والے مسلمان کا دل تھا چنانچہ اس نے امانت خداوندی کو پہاڑ کی طرح اٹھایا اور اسلام کا ہندوستان میں از سرِ نو احیاء کیا۔

چنانچہ ۲۹ ذیقعد ۱۱۰۲ھ کے رقعہ میں رقمطراز ہے کہ۔

"چونکہ میرا چیا باپ تم سے راضی ہے بیشک سلطنت تم کو ملے گی۔ ہمارے بزرگوار اعلیٰ حضرت کی رضامندی میرے شامل حال نہ تھی کیوں کہ وہ داراشکوہ کے

مددگار تھے اور ہندوؤں کی مصاحبت اور بے ایمان جوگیوں کی دوستی میں مبتلا تھا۔ محض سیدالمرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کی اعانت فتح کا سبب بنی۔

حکومت حاصل کرنے کے بعد پچاس سالہ دور میں ہزارہا مشکلات آئیں جن کا بادشاہ نے اپنے تدبر، ہمت، استقلال اور بہادری سے مقابلہ کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس عظیم انسان کے کردار پر کوئی حرف نہیں آیا جو آئین جہانبانی شریعت اسلامیہ سے ماخوذ ہے اسی نے رقعات میں اس کی تعلیم دی۔ اور اسی پر برابر عمل پیرا رہا۔

پچاس سال حکومت کرنے والوں میں اکبر، الزبتھ اول، ملکہ وکٹوریہ وغیرہ ہیں اتنے طویل عرصہ میں سیکڑوں نشیب و فراز آتے ہیں لیکن عالمگیر کا دورِ حکومت سب سے زیادہ امتیازی شان رکھتا ہے اس نے چند اصولوں پر زندگی گزاری اور ان ہی اصولوں پر حکومت کی۔ اگر بے تعصبی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مکمل طور پر کامیاب مسلمان حکمران تھا۔

اب میں خافی خاں کی منتخب اللباب سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے اورنگ زیب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایک مورخ ہے جو واقعات لکھتا ہے لیکن بادشاہ کا حامی نہیں ہے اس کے باوجود موقع بے موقع اس سے تعریف ہو جاتی ہے۔

راجہ جسونت سنگھ نے جب پہلی بار حملہ کیا تو بڑا شدید حملہ ہوا اور لوٹ مار مچی۔ عالمگیر ہی کا ظرف اور حوصلہ تھا کہ اس قیامت کے ہنگامہ میں وہ سنجیدگی اور وقار کی چٹان بنا ہوا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے رویہ میں تغیر اور سراسیمگی کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں دکھائی دیا بلکہ وہ یہ سارے احکامات نافذ کرتے اور تدبیر کرتے ہوئے نہایت خوشدل اور بشاش نظر آرہا تھا۔ کم حوصلہ لوگوں کی طرح نہ تو اس نے بدحواسی کا مظاہرہ، نہ غیظ و غضب ظاہر کیا، نہ کوئی اس کی زبان سے تند و تلخ فقرہ نکلا بلکہ نہایت اطمینان مگر بڑے تحکمانہ انداز

میں وہ بھی انتشار کو دور کرنے اور پراگندہ جمعیت کو اکٹھا کرنے میں مصروف رہا اس کی جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو نہ معلوم بدحواسی میں کیا کچھ کر گذرتا۔ مگر عالمگیر نے اس واقعہ کو اپنے لئے نیک فال ہی تصور کیا۔ چنانچہ وہ کہا کرتا تھا اللہ کا شکر ہے کہ اس ذریعہ سے دوست دشمن، موافق و منافق کی پہچان ہوگئی اور اس کسوٹی پر ہر ایک کا کھوٹا کھرا معلوم ہوگیا اس لئے ہم تو اس واقعہ کو عطیۂ الٰہی اور وسیلۂ کامرانی سمجھتے ہیں اور جو کوتاہ اندیش منافق اس واقعہ کو غنیم کا غلبہ تصور کرکے اس کے لشکر میں چلے گئے ہیں وہ اس کا انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

اس موقع پر ایک مست جنگی ہاتھی سر پر چلا آرہا تھا مگر بادشاہ کے عزم اور استقامت کا یہ حال تھا کہ وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا بلکہ اس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈلوا دیں اور بندوق سے سامنے والے فیل بان کو اڑا دیا۔

دارا شکوہ سے مقابلہ کے بعد خافی خاں رقمطراز ہیں۔

عالمگیر اجمیر کے آستانہ پر

بادشاہ عالمگیر کے ساتھ تائید الٰہی تھی کہ ان چار جنگوں میں ایسے بہادر جنگجو دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی اور نازک سے نازک وقت میں اور بڑے سے بڑے حادثہ میں وہ ثابت قدم رہا۔ اور دشمن کے غالب آجانے کے باوجود اس کو شکست دے کر بھگا دیا جب اس کو دارا شکوہ کے فرار اور فتح پانے کی خبر ملی تو سجدۂ شکر بجا لایا شاہ نواز خاں اور شیخ میر کے واقعہ پر بڑے افسوس کا اظہار کیا۔ اور حکم دیا کہ دونوں کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضہ میں لے جا کر دفن کریں۔

فتح کے بعد عالمگیر خواجہ صاحب کے مزار پر گیا اور وہاں کے خدام کو انعام واکرام دے کر کوچ کیا۔ اور آناساگر کے کنارے تین چار دن کے لئے چھاؤنی ڈال دی یہاں سے راجہ جے سنگھ کو ایک لاکھ روپیہ اور بہادر خاں کو تیس ہزار روپیہ عنایت کرکے

دونوں کو دارالشکوہ کے تعاقب کے لئے مقرر کیا اور ان کو خلعت، گھوڑا، ہاتھی وغیرہ اعزازات سے نواز کر رخصت کیا۔

بادشاہ نے رفاہ عام کے مد نظر راہداری اور پاندری کے محصول معاف کردئے۔ راہداری کا ٹیکس ہر راستہ پر اور سرحدوں گھاٹوں پر وصول کیا جاتا تھا اور اس کے تحت ایک بڑی رقم سرحدی خزانہ میں جمع ہوتی تھی۔ پاندری وہ محصول تھا جو ماہانہ اور سالانہ کے حساب سے کرایہ زمین کے نام سے وصول کیا جاتا تھا۔ ہنرمند اور قصاب۔ کلال، سبزی فروش، بزاز، جوہری، صراف، بازاروں میں جہاں جہاں دوکان لگاتے تھے اور خرید و فروخت کرتے تھے یہ محصول سرکار میں جمع کراتے تھے۔

تاریخ داں کے پاس عموماً پوری تاریخ سامنے ہوتی ہے۔ اور وہ کہیں کہیں سے واقعات لے کر اندازہ لگالیتا ہے۔ حالانکہ انسانی زندگی بڑی عجیب و غریب رفتار سے حالات و واقعات میں گھل مل کر محوخرام رہتی ہے۔ اور کوئی بعد میں آسانی سے رائے قائم نہیں کرسکتا۔ کہ کس وقت کونسا فعل صحیح تھا، اور اسکی ذمہ داری کس پر تھی۔

دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان پوری زندگی کسی خاص اُصول کے تحت گذارتا ہے یا نہیں۔ اس لئے جو لوگ اصول پر مرتے ہیں وہ یا شہید ہوتے ہیں یا غازی یہ مرتبہ اسی کو اسی ہے جو خود غرضی اور نفس پرستی سے مبرا ہو۔ ہم اس عظیم المرتبت شہنشاہ کی زندگی سے یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ غازی تھا۔ عادل، عالم، امیر، بہادر، مجاہد تھا۔ جس نے اصولوں پر اساس سلطنت قائم کی اور تاریخ عالم میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

عالمگیر کے کردار و عمل کا تجزیہ

خطوط کی روشنی میں

آنندا فروغ ملوبی کا کوروی

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط نہ صرف شاہجہاں کے نام بلکہ دوسروں کے نام کثیر تعداد میں محفوظ اور طبع شدہ موجود ہیں جو ادبی اعتبار سے ہی اہمیت نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان سے زمانہ کے واقعات و حالات پر پوری روشنی پڑتی ہے خصوصاً اس وقت جب اس کے خطوط کا خود شاہجہاں اور اس کے دوسرے بیٹوں کے خطوط کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

شہنشاہ عالمگیر پر انگریز مورخین نے سخت اعتراضات کئے ہیں۔ اس کو غاصب اور متعصب قرار دیا ہے، اور عرصہ دراز تک عالمگیر کو لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اس وجہ سے بھی کہ معاصر مورخین مثلاً خافی خاں اور مؤلف مآثر الامراء وغیرہ خدا جانے کیوں عالمگیر سے خوش نہ تھے اور انہوں نے اس کے ساتھ انصاف اور غیر جانبداری نہیں برتی اس صدی میں سر جادو ناتھ سرکار نے عالمگیر کے حالات میں ایک مبسوط کتاب لکھکر تاریخ میں ایک بیش قیمت باب کا اضافہ کیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ بھی تعصب سے خالی نہیں۔ نیز اسی صدی میں عالمگیر کے حالات پر متعدد کتابیں لکھی گئیں اور نئی تحقیق

نے اس کے کردار وعمل کے تاریک گوشوں کو روشن کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی کے مضامین چودھری نبی احمد مرحوم ڈی۔ ایس۔ پی۔ کی وقائع عالمگیر تاریخ میں بیش قیمت اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سید نجیب اشرف ندوی دار المصنفین اعظم گڑھ نے رقعات عالمگیری کی پہلی جلد شائع کی ہے اور جیسا انہوں نے اس جلد کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے اس کے چار مزید حصے شائع ہونا باقی ہیں اس کتاب میں نہ صرف عالمگیر کے کثیر خطوط موجود ہیں بلکہ کچھ خطوط شاہجہاں، داراشکوہ، شجاع، مراد بخش اور شاہزادی جہاں آرا بیگم وغیرہ کے بھی موجود ہیں جن کی مدد سے اس زمانے کے سیاسی و تاریخی حالات پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے اور عالمگیر کا کردار وعمل آئینہ ہو جاتا ہے اور وہ تمام الزامات جو اس پر لگائے جاتے ہیں غلط ثابت ہوتے ہیں۔

سید نجیب اشرف کے اس مجموعہ میں عالمگیر کے وہ خطوط بھی موجود ہیں جو زمانۂ شاہزادگی میں اس نے شاہجہاں کو لکھے ہیں۔ ان خطوط سے یہ امر تحقق ہو جاتا ہے کہ اس کو شاہجہاں سے غیر معمولی عقیدت ومحبت تھی۔ اور وہ جزئی معاملات سے بھی اس کو باخبر رکھتا تھا اور ان میں بھی اس کی ہدایات حاصل کرتا اور اور ان کا پابند رہتا تھا۔ مثال کے طور پر ذیل کا خط نمونہ از خروارے سمجھا جا سکتا ہے۔

"مرید اخلاص سرشت آداب ارادت بتقدیم رسانیدہ، ذرہ آسا بعرضِ اقدسِ اعلیٰ میرساند کہ ایں مرید عقیدت آئین کہ شرف حضور پرنور پیرو مرشد خود را سرمایۂ سعادت دوجہاں می داند و ہیچ دولت را بداں نمی سنجد، بعد دستوری یافتن از پیش گاہ خلافت بموجبے کہ دستوری یافتہ بود طے مسافت نمودہ بششم

منزل از باغ صفا ربہ پیشاور رسیدہ سلخ بنوشہرہ منزل کرد و روز
مبارک عہد در آں جا اتفاق افتاد تسلیمات مبارک باد
بجا آوردہ زبانِ عقیدت براسم تہنیت گویا ساخت ،
حق عزوشانہٗ ایں روز سعادت افروز را بر ذات مقدس
مبارک وخجستہ گردانیدہ سایۂ لطف وعنایات پیر و مرشدِ حقیقی را
بر مفارقِ مریداں مستدام دارد

پیر دستگیر سلامت ! ایں فدوی بموجب حکم ارفع می خواست
کہ از پیشاور بہ سہ منزل بکنار دریائے سندھ بے توقف عبور نماید،
لیکن چوں معلوم شد کہ از شدتِ آب تا حال پل مرتب نہ گشتہ
و بادشاہ زادۂ جہانیاں ہنوز ایں روئے آب مقام دارند
و اکثر بندہ ہائے درگاہ خلائق پناہ کہ رخصت یافتہ اند در آں جا
جمع آمدہ کشتیہا آں مقدار نیست کہ تمامی آں مردم بالشکر
ایں فدوی بے تاخیر توانند گذشت و کنار دریا بجہت کمی علف
مقام بسیار نمی تواں کرد، بنابراں قرار دادہ کہ چند روز
نوشہرہ و انکودہ توقف نماید، اگر دریں ضمن شدتِ آب فرو
نشنید و پل بستہ شود فبہا، و الا انشاء اللہ تعالی بکشتی گذشتہ کوچ بکوچ
عازم مقصد خواہد شد[1]

" آفتاب جہاں تاب خلافت تابند بہ باد"

اسی بنا پر اس پر شاہجہاں کو پورا اعتماد تھا۔ اس کی غیر معمولی کامیابیوں نے بھی

---

[1] رقعات عالمگیر صفحہ ۷۰ ، خط نمبر ۶/۴۸

شاہجہاں کی نظر میں اس کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ اور دوسرے بھائیوں پر اسے فوقیت حاصل تھی، چنانچہ اپنے ایک خط میں شاہجہاں کو لکھتا ہے۔

"برائے خورشید ضیا پوشیدہ نماند کہ ایں مرید ہیچ گاہ باظہار محاسن افعال خویش نپرداختہ ہموارہ بدبہائے خود معترف بودہ و ہست، واز آں زماں کہ بسن تمیز رسیدہ در استرضائے خاطر ملکوت ناظر دقیقہ از دقائق جد وجہد فرو نگذاشتہ باآں کہ بتقریب بادشاہزادۂ کلاں کہ ہنرے جز خوش آمد ظاہری و چرب زبانی و خندۂ بسیار نداشت و در خدمت ولی نعمت دلش بازبان موافق نبود از کردار ناقابل او چندیں ناشنیدہ انواع خفت می کشید چنانچہ فرامیں سابقہ بداں ناطق است بایں امید کہ شاہد صدق عقیدت و بندگی را نتیجہ پدید آید اصلاً از طریق عقیدت و انقیاد انحراف نورزیدہ بہیں کہ اعلیٰ حضرت ایں مرید را بعنوان رضا جوئی یاد می فرمودند خرسندی بود۔"[1]

شاہجہاں کی طویل علالت کے زمانہ میں دارا شکوہ نے ان تینوں بھائیوں کو پریشان کرنا شروع کردیا ان کے وظائف بند کر دئے جاگیریں ضبط کرلیں انہیں فوجیں بھیجیں اس سے ان کو شبہ پیدا ہوگیا کہ شاہجہاں کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور ایسا مشہور بھی تھا۔ جسونت سنگھ کو لکھتا ہے۔

بندگان اعلیٰ حضرت در قید حیات اند کہ ایں شہر تہمت محض

---

[1] رقعات عالمگیر صفحہ ۲۲۵

بجہت فریب و دغائے با برادران است؟[۱]

گو مراد نے اس خبر کو جھٹلایا ہے مگر ان تینوں بھائیوں کو یہ اندیشہ تھا

کہ اگر یہ خبر صحیح نکلی تو دارا شکوہ کا بادشاہ ہو جانا نہ صرف ہم تینوں بھائیوں کے لئے مضر ہوگا،

بلکہ ملک، قوم اور دین اسلام کے لئے بھی اس کا بادشاہ ہو جانا سخت خطرناک

ثابت ہوگا۔

انہیں خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں بھائی دارا شکوہ کو ملحد

و کافر سمجھتے تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے جیسا کہ خود اس عہد نامہ میں جو عالمگیر نے

مراد بخش کی درخواست پر اسے لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کی عبارت ذیل سے

ظاہر ہے۔

"و تمامی نیت حق طویت مصروف آن است کہ بمساعی

غازیان ظفر لوا و زور بازوئے مجاہدان نصرت انتما خارِ الحاد و

زندقہ از گلشن ہمیشہ بہار دیار اسلام برافتادہ رئیس الملاحدہ با یارانِ

و احزاب خویش نیست و نابود شود"[۲]

"رئیس الملاحدہ" سے مراد، دارا شکوہ ہے۔ آگے کے پیرے میں لکھا ہے۔

"بعد استیصال آن دشمن دین و دولت و استقرار و انتظام

امور سلطنت، نیز بر جادہ قدیم وفاق و اتفاق استقامت

ورزیدہ ہمیں دیگر ہمہ وقت و ہمہ جا و در ہمہ کار رفیق و شریک

باشند"[۳]

---

[۱] رقعات عالمگیر ص ۲۶۴ ۔ [۲] رقعات عالمگیر ص ۲۶۴ ۔

[۳] رقعات عالمگیر ص ۲۶۵

یہاں "دشمن دین و دولت" سے مراد دارا شکوہ ہے اسی طرح مراد بخش نے اپنے ایک خط میں عالمگیر کو لکھا ہے۔

"حقیقت رفتن ملحد زادہ بھوپ تپنہ بوجیہ کہ تلمی شدہ
وکیل ہم نوشتہ بود، ہرچہ از دستش بیاید بکند وہرچند زود تر
بکند برائے ما بہتر است نہایت"[1]

اس خط میں جو مراد بخش نے عالمگیر کو لکھا تھا "ملحد" سے مراد دارا شکوہ ہے اور "ملحد زادہ" سے مراد سلیمان شکوہ پسر دارا شکوہ ہے۔

انہیں خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کی طویل علالت کے زمانہ میں دارا شکوہ نے شاہجہاں کو بالکل معطل کر دیا تھا۔ اور خود اس کے نام سے حکومت کرتا تھا چنانچہ عالمگیر خود شاہجہاں کو لکھتا ہے۔

"قبلۂ دین و دنیا سلامت! چوں مکرر استماع یافتہ کہ
ذات ملکی صفات از تکسیر بدنی نہایت نقاہت وضعف بہم
رسانیدہ وہمیں برادر متصدی امور سلطنت شدہ، اوامر
واحکام بادشاہی بدون عرض اقدس بطور خود سرانجام داد
وہیچ امرے باختیار والا نگذاشتہ حتی کہ خطاب خانی و
منصب کلاں بہ نوکراں خود می دہند و در اکثر صوبہ جات
وچکلہا جیکاران دیوانیاں وفوجداران و وقائع نگاراں ودیگر
اہل خدمت از جانب خود تعین کردہ اندو برائے نام بود رائے
دایاں مرادر کچہری می نشانند والا تمام رتق وفتق معاملات خاص

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۳۶۲

ودیگر امورِ مالی و ملکی بعہدۂ اہتمام معین الدین خاں کہ امسال خطاب وزیر خاں یافتہ مقرر کردہ اند و تعین بخلق افواج برسر برادر والا قدر محمد شجاع بے صلاح آں قبلۂ جہاں و جہانیاں بوقوع آمدہ ہرگاہ حال چنیں باشد، مریدان خاص و فرزندانِ با اخلاص را لازم است کہ خار از میان بر داشتہ بدریافت ملازمت قبلہ و کعبۂ حقیقی سعادت دارین حاصل کنند و دریں وقت بخدمت فیض موہبت متعد گردیدہ بموجب حکم قدسی در تشیت و انتظام ممالک محروسہ کہ از بد پردازی ہمین برادر درہم خوردہ سعی و اجتہاد بکار برند و ہر کہ از بندہائے بادشاہی بمقتضائے حرام نمکی مصدر شوخی و بے اعتقادی گردیدہ سزائے لائق در کنار او نہند۔

لہذا ایں فدوی عقیدت سرشت بعزم سرانجام مطالب معروضہ فی الصدور از مکان اقامت خود کوچ نمود، امید آں است کہ بعنایت الٰہی و اقبال عدو مالِ حضرت شہنشاہی باسرع اوقات کامیاب مافی الضمیر شود زیادہ عرض گستاخی است[1]۔"

نیز دارا شکوہ نے شاہجہاں کے خط و دستخط کی نقل میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اور وہ شاہجہاں کے نام سے احکام صادر کرتا تھا جن کی شاہجہاں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ مراد بخش عالمگیر کو اپنے ایک خط میں لکھتا ہے۔

"بجہت بر ہم زدنِ قرب و جوار مکر و حیلہائے فراواں خواہد انگیخت کہ شاید ایں صوبہ را از مخلص تواند گرفت، و دریں باب احکام و فرامین

بتو بہ بسیارے را اختراع خواہد نمود[1]"

پھر ایک دوسرے خط میں مراد بخش ہی عالمگیر کو لکھتا ہے۔

"ملحد خود تقلیدِ خط اقدس را بمرتبۂ کمال رسانیدہ
بر فرامین دستخط خودمی کند، ازاں جملہ فرمانے است کہ دریں
ولا بہ مخلص رسیدہ[2]"

یہاں بھی ملحد سے مراد داراشکوہ ہے جیسا ذیل کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے اختیارات حاصل کرتے ہی شجاع، عالمگیر اور مراد بخش تینوں بھائیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی شروع کردی۔ ان کی جاگیریں ضبط کرنے کے احکام صادر کئے، نقد وظائف بند کر دیے، عالمگیر بیجا پور کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اور عنقریب فتح ہونے والی تھی کہ داراشکوہ نے مخالف سے ساز باز کر کے عالمگیر کو نقصان پہونچانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ عالمگیر ذیل کے خط میں خود شاہجہاں کو لکھتا ہے

"بعرض اشرف حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی می رساند کہ چوں اختیار رزداری ملکی و مالی آں حضرت شاہزدہ دمواد استقلال و تصرف شاہزادۂ کاشمان در حل و عقدِ امور جہانبانی از حد گذشتہ کہ بشرح و بیاں راست آید، لاجرم بوسیلۂ مزید عزت و اعتبار و علت دوام تسلط و اقتدار ہموارہ در مقام ایذا و آزار نیاز مند بودہ و در بر کار بر طبق رغبتِ خواہش طبع خویش، آنچہ متضمن فساد بلاد و عدم صلاح عباد بود عمل می آورد و راہ منافع از ہر سو بر روئے خیر اندیش مسدود

---

[1] ص ۲۶۱ واقعات عالمگیر

[2] ص ۳۶۶ رقعات عالمگیر

ساختہ خواست کہ باین طریق ابواب داخلِ خزانہ دکن کہ قلت ازان علت خرابی و پراگندگی لشکر است بر روی روزگار این رضاجوئے فراز شود. چنانچہ درین وقت کار کہ حسب الحکم لشکر بر بیجاپور کشیدہ بصد ہزار سعی کار بر آنہا تنگ ساختہ در ضیقِ تبل داشت و نزدیک بود کہ مشتی کش گران مند گیرد یا ہمہ را استیصالِ مطلق ساختہ بے جان و بے پا کنند، سرزا دلان شدید لطلب لشکر فرستادہ، نہانی نوکران خود بقصد تسلی قلب و استمالت خاطر بیجاپوریان تعین نمودہ وقوع این معنی و خبرہائے مختلف کوفت اشرف موجب خیرہ چشمیِ غنیم گشتہ وہن و فتور تمام درمیانی ثبات قلب دلاوران لشکر راہ یافت و بنابرین مصلحت کہ عین مفسدہ بود اکثر مردم سر خویش گرفتہ بہر طرف متفرق شدند، اگر خدا نخواستہ در ملک غنیم زخم عظیم بہ لشکر ظفر اثر می رسید و در سائر اقلیم سبعہ شہرت یافتہ موجب خفتِ دولت پایدار می شد، یقینی کہ تلافی و تدارکِ آن از حیز امکان و قوتِ اقتدارِ اشرف بیرون بودہ از عدم عاقبت اندیشی شہزادۂ کلان عمرہا صورت نمی بست، کرم الٰہی نیاز مند صاحب این حال بود کہ با وجود بے مددی اعوان و انصار دل بر کارگری تائید الٰہی بستہ و نظر بر راہ عقدہ کشائی اقبال کشادہ اہل عناد را سر کوفتہ و گوش تافتہ

بعد از فوز مطلب با خیل سعادت صحیح و سالم از معدود آں ملک گذارہ شدہ بمقصد پیوست۔

وبا وجود ایں مایہ بے مددی و کارشکنی اکتفا نمودہ بہ سابقہ تقصیر و اندک بے ادبی و لغزش کہ مستلزم فی الجملہ کم لطفی و سزاوار کم توجہی آں حضرت بودہ باشد حالے برار از جاگیر ایں ہیچ مدانے درست اعتقاد رضا جو تغیر نمودہ تنخواہ طلب آنچناں ناخلفے کہ بے موجب سر از دائرۂ اطاعت و انقیاد بر آوردہ مصدر گوناگوں بے ادبی و فساد گردیدہ بود نمود و بر وفق ارادۂ ناصواب ہمگی مطالب صحیح و ذاتی دولت خواہ را بطریق ناشائستہ خاطر نشان اشرف کردہ جسونت سنگھ را با لشکرے گراں سنگ بقصد انتزاع مختصر ملکے کہ نامزد این نیاز مند شدہ بود فرستادہ قصد آں نمود کہ بہر صورتے کہ رود و بہر طریق کہ پیش رود قطعاً تا ختم تعلک خیر اندیش در محالی متعلقہ بادشاہی ہند نگشتہ یک کف زمین نیز در قبضۂ قبض و تصرف خیر خواہ نماند[1]۔"

اور جیسا مندرجہ بالا خط سے ثابت ہوتا ہے کہ دارا شکوہ نے راجہ جسونت سنگھ، اپنے بیٹوں اور دیگر امراء کی سرکردگی میں ان تینوں بھائیوں پر فوج کشی کی ایک دوسرے خط میں عالمگیر شاہجہاں کو لکھتا ہے۔

"چناں کہ سلیمان شکوہ پسر دارا شکوہ را با فواج

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۱۹۹

گراں بر سر شاہ شجاع کہ فرزند رشید آں حضرت است تعین کرد
ناموس نام کی دودمانہ او بباد فنا در دادہ آنچنانچہ مایہ
مذلت و خفت از نوامۂ پرویز برادر شاہجہاں کشیدہ در
پیش اہل جہاں خجل و شرمسار گردیدہ۔
و ہمچنیں بمقتضائے ہوائے نفس و خواہش طبع خویش
بنائے کار براں نہادہ پیوستہ در تحقیق و تفتیش احوال
و تفضیح و تخریب مہام ایں نیاز مند بذل جہد می نماید و ہمیشہ
کارہائے مبائن دین و ملت کہ مستلزم فساد امور بلاد و
عباد باشد از و بظہور می رسد، ابواب منافع و مداخل بر
روئے روزگار ایں خیرخواہ مسدود گردانیدہ انواع منقصت و
اقسام مضرت رسانیدہ۔[1]"

ان تینوں بھائیوں کے خطوط بھی شاہجہاں کو نہیں پہونچتے تھے۔ اور اسے ان حالات کی بالکل خبر نہ تھی۔ جیسا کہ مراد بخش نے ذیل کے خط میں شاہجہاں کو لکھا ہے۔

"چوں دادا بھائی جیو (دارا شکوہ) در ایام عارضۂ
مزاج مقدس مصدر ادائے چندیں کہ ہمہ مخالف طرز
پسندیدۂ حضرت اعلیٰ بود گشتہ راہ ہائے نوشتجات و کلا
و آمد و رفت اخبار دربار جہاں مدار مسدود و صاحتہ عالم
را بشورش در آوردند و با برادراں خصوصاً باین مرید بدسلوکی
کہ باوجود ذات مقدس مبارک امکان نداشت پیش گرفتہ

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۱۰۰۔

نگذاشتند کہ عرائض کمترین مریداں کہ بہ ہم پدر گاہِ آسماں جاہ ارسال داشتہ بود، بنظر اشرف اقدس اعلیٰ در آید تا بجواب چہ رسد؟[1]

شاہجہاں کے صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ اسی طرح معطل و نظر بند رہا۔ جس کی شکایت بھی اس نے اپنے ایک خط میں کی ہے۔ بالآخر شجاع، عالمگیر اور مراد بخش کو یہ شبہ ہوا کہ شاہجہاں کا انتقال ہو گیا ہے اور دارا شکوہ نے اس واقعہ کو چھپا رکھا ہے۔ اور متسلط ہونا چاہتا ہے۔ عالمگیر شاہ شجاع کو لکھتا ہے۔

"در اثناء بیماری بہ بادشاہ ہفت کشور حادث شدہ دارا شکوہ از ہمہ طرف راہ ہا مسدود و وکلاء را محبوس ساختہ افراد کائنات را مظنہ خبر اندوہ اثر انتقال بادشاہ افتادہ وچنانچہ بادولت خود ہم بریں مظنہ برملا خستہ دیدہ دوربیں خطبہ خواندہ اند وسکہ رائج کردہ بدعوئ تخت وتاج بصوب دار الخلافت حضرت دہلی نہضت فرمودہ اند۔"[2]

اسی زمانہ اقتدار میں دارا شکوہ نے ہندوؤں کی بے حد طرفداری کی اور بعض جگہ ان کی طرفداری میں مسلمانوں کو نقصان بھی پہونچایا اور مساجد و مقابر تک منہدم کرادیے۔ یہ حرکات خلاف دین تھیں اور ان سے دوسرے بھائیوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اگر یہ ملحد بادشاہ بن گیا اور اس کے ہاتھ مضبوط ہو گئے

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۳۴۵

[2] رقعات عالمگیر ص ۲۵۹

تو نہ صرف یہ کہ خود ان تینوں بھائیوں کے جان و مال کے لئے شدید خطرہ ہے
بلکہ اسلام بھی خطرہ میں ہے۔ اس لئے ان تینوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے
کہ وہ اس فتنہ کو دفع کریں، اور خود کو دینِ اسلام اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ
رکھیں۔ ذیل میں عالمگیر کے ایک خط کا اقتباس اس جو شاہجہاں کے نام
ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"قبل ازیں مکرر معروض خدمتِ والا گردیدہ کہ
مقصود ایں مرید از نہضت بصوب اکبرآباد ارادۂ بغی
و خروج با بادشاہ اسلام نبود و عالم السر و الخفیات
گواہ است کہ ایں قصدِ ناصواب غیر مشروع اصلاً و قطعاً
پیرامن ضمیر نگشتہ بلکہ چوں در آوانِ بیماری اختیار از دست
اعلیٰ حضرت رفتہ بود و بادشاہزادہ کلاں کہ رنگے از
مسلمانی نداشت قوتِ استقلال تمام پیدا کردہ، امارتِ
جہانبانی ظاہری ساختہ و رایت کفر و الحاد در ممالک
محروسہ می افراشت، دفع او را کہ عقلاً و شرعاً و
عرفاً واجب شدہ بود بر ذمتِ ہمت متحتم شناختہ
عزیمتِ ایں حدود نمود و جنگ اول با کفار اشرار کہ
مساجد را منہدم و خراب ساختہ، بتخانہ ہائے آں
بنا نہادہ بودند، رو دادہ محاربۂ دیگر با ملاحدۂ
نکوہیدہ کردار واقع شد و چوں نیت بخیر بود با جمعیتِ
قلیل در ہر معرکہ مظفر و منصور آمدہ از چشمِ زخم مصئون
ماند۔" (رقعاتِ عالمگیر ص ۲۲۳)

مراد بخش نے اپنے ایک خط میں عالمگیر کو لکھا تھا۔

"بعقیدۂ مخلص حضرت درمیان نیستند و اگر بفرض محال هستند، جز نامے بیش نیست بهرحال معامله یکرو شده و کار از اصلاح گذشت، چوں نیتِ امداد و اعانتِ دینِ محمدی ست صلی اللہ علیہ وسلم، بہ یقین می دانم کہ فتح و نصرت غیبی و جنود الٰہی با ماست خاصه وقتے کہ باہم متفق باشیم[۱]"

مراد بخش نے ایک سردا۔ موسوم بہ افتخار خاں کو بھی لکھا تھا۔

"از انجاکہ ما ہر سہ برادر باہم متفق و یکدل و یک رو گشتہ ہمت حصولِ مطلب اعلیٰ بستہ ایم و درین ضمن مقصد اصلی رواج دینِ محمدیست، یقین حاصل کہ فتح و ظفر نصیب اولیائے دولت ماست، وقت دریافت شرف حضور پر نور ہمیں است کہ اُردوئے ظفر قرین نزدیک رسیدہ و عنایتِ ما را دربارۂ خود مرتبۂ اعلیٰ شناسد[۲]"

جیسا مراد بخش نے مندرجہ بالا خط میں لکھا ہے، تینوں بھائیوں یعنی شجاع اورنگزیب اور مراد بخش میں ایک خفیہ معاہدہ ہوا[۳]۔ اور بالآخر اس غرض سے کہ اگر شاہجہاں زندہ ہے تو اس کو دارا شکوہ کی قید سے نجات دلائی جائے۔ یہ لوگ آگرہ کی طرف مع اپنی افواج کے روانہ ہوئے، جیسا کہ اوپر دئے ہوئے

---

۱ رقعات عالمگیر ص ۳۷۱

۲ رقعات عالمگیر ص ۲۶۴۔

۳ رقعات عالمگیر ص ۳۸۴

خطوط سے ثابت ہے۔ عالمگیر ایک دوسرے خط میں خود شاہجہاں کو لکھتا ہے۔

"چون مجاریِ احوال بریں منوال مشاہدہ افتاد وسابق کار بریں نہج ملاحظہ گردیدہ آں حضرت از روئے بے اختیاری مطلقاً باختیار او شدہ مقید تفتیش امور ملکی نمی شوند و سائر فرزنداں را بگفتۂ او دشمن انگاشتہ بہر چہ تجویز نماید فرامین صادر می فرمایند، پاس ناموس عزت بر ذمت ہمت گرفتہ بخاطر قرار داد کہ خود بسعادت ملازمتِ اشرف رسیدہ حقیقتِ معاملہ را بوجوہ معقولہ خاطر نشان اشرف سازد۔ راجہ جسونت سنگھ از ورود وصدور ایں مرید خبر یافتہ بتحریکِ کمال بے سعادتی ہنگام کوچ سرِ راہ بر عبور خیل اقبال گرفت ناچار طریقِ تنبیہ و گوشمالیٔ آں کوتاہ اندیش فراپیش گرفتہ آں سست رائے را کہ خارِ مانع سرِ راہ شدہ بود شکستِ فحت دادہ از راہ برخیزانیدہ شد۔

بر رائے عالم آرائے ظاہر ست کہ اگر سوائے دریافت سعادت ملازمت ارادۂ دیگر می بود بدستِ آوردن او و مراہانش کہ بحال تباہ در روز سیاہ پے سپرِ وادی ہزیمت بودند چہ قدر کار بود۔

اکنوں شنیدہ می شود کہ شاہ بلند اقبال (دارا شکوہ) لوائے خصومت برافراشتہ بارادۂ مقابلہ بہ دھول پور

رسیدہ اند، چوں موجہ ایشاں باہمپوئے غنیمے لشکر شکن
بہیچ وجہ صورت بستنی و نقش مراد کش باشل عریضے پرفن
املا درست نشستنی نیست، صرفہ درین است کہ معاملہ را
بطرح انداختہ چندے بصوب پنجاب کہ در توالیشاں
مقرر است شتافتہ خدمت حضور اقدس باختیار این مرید
مرشد پرست واگذارند اجدازاں بہرچہ رائے عالم آرائے
اقتضا کند بعمل خواہد آمد۔"

عالمگیر اور مراد بخش آگرہ کی طرف سے اپنی افواج کے روانہ ہوئے اور جیسا مراد
بخش نے شجاع کو لکھا تھا کہ۔

"مقرر گشتہ کہ ازاں طرف بھائی ؛ یوو ازیں طرف
مخلص بر اوجین در آمدہ راجہ جسونت سنگھ را کہ باجمعے در انجا
نشستہ برداشتہ روانہ اکبر آباد شویم انشاء اللہ تعالی
عنقریب ازیں کار فارغ شدہ راہ مطلب گرفتہ
می شود۔

امید کہ آں صاحب والا قدر فوج مقابل را برہم
زدہ خیلے راہ بقصد نزدیک شدہ خواہند بود باہر دو
برادر را ہم باں حد ود رسیدہ دانند۔"

عالمگیر اور مراد بخش اوجین کے قریب پہونچے تھے کہ راجہ جسونت
سنگھ جسے داراشکوہ نے ان دونوں کی راہ روکنے کے لئے مقرر کیا تھا اس سے سخت
جنگ واقع ہوئی اور راجہ جسونت سنگھ سخت نقصانِ جانی و مالی اٹھا کر بھاگ
کھڑا ہوا۔ اور جیسا مراد بخش نے شجاع کو لکھا ہے۔

بعنایت الٰہی ایں چنیں فتح کہ دریں صد سال کسے
یاد ندارد روزی شد، شکر ایں عنایتِ الٰہی کہ دریں وقت
شامل حال گردیدہ طاقت بشری از ادائے آں عاجز و قاصر
است ۔ انشاء اللہ تعالیٰ بعد ازیں راست بہ اکبرآباد و دہلی
میرود ۔ می باید کہ صاحب قبلہ ہم زود تر متوجہ آں طرف
شوند کہ بالاتفاق ملحد را از بیخ و بن برانداختہ شود۔"[1]

یہ ایک زبردست کامیابی تھی اس کے بعد داراشکوہ خود مقابلے پر آیا
اور اس نے بھی شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی اور بالآخر گرفتار
ہو کر قید ہوا۔

داراشکوہ نے شاہجہاں کو نظر بند کر رکھا تھا اور خود بادشاہ بن بیٹھا تھا۔
مگر شاہجہاں بوجہ علالت و ناسازی مزاج بادشاہت کا کام اس پر چھوڑے ہوئے
تھا۔ اور بخیال خود معذور اور گوشہ نشین تھا۔ درحقیقت وہ داراشکوہ کی قید
میں تھا۔ اور نظر بند تھا۔ مگر اس کی چکنی چپڑی باتوں سے اُس پر اس قدر مہربان
تھا کہ داراشکوہ کو جسے اس نے پہلے ہی سے ولی عہد مقرر کر رکھا تھا۔ اب اپنا
نائب سمجھ لیا۔ عالمگیر نے ایک خط میں شاہجہاں کو لکھا ہے۔

"ایں مرید از آں زماں کہ بسن تمیز رسیدہ در استرضائے
خاطر ملکوت ناظر دقیقۂ از دقائق جد و جہد فرو نگذاشتہ با آنکہ
بتقریب بادشاہزادہ کلاں کہ منزے جز خوش آمد ظاہری
و چرب زبانی و خندہ بسیار نداشت در خدمت ولی نعمت
دلش بازبان موافق نبود از کردار ناقابل او چندیں نا
شنیدہ انواع خفت می کشید چنانچہ فرامین سابق بداں

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۳۵،

ناحق است [1]

شاہجہاں کو جیسا کہ مندرجہ بالا خطوط سے ظاہر ہے داراشکوہ کے ظلم و زیادتی کا جو اس نے ان تینوں بھائیوں کے ساتھ روا رکھی تھی اطلاع بھی نہ تھی ان تینوں کے خطوط شاہجہاں کو نہ پہونچنے کی وجہ سے وہ اصل حالات سے بالکل بے خبر تھا اور اسی بنا پر وہ عالمگیر کو داراشکوہ کے مقابلے میں مجرم سمجھتا تھا۔ اور عالمگیر کو بجا طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اختیارات شاہجہاں کو بحال کر دئے گئے تو وہ عالمگیر کو سخت سزا دے گا۔ اس لئے عالمگیر مجبور تھا کہ شاہجہاں کو اسی حالت میں رکھے جس میں داراشکوہ نے اسے نظر بند کر رکھا تھا۔ اور کم سے کم کچھ دنوں ایسا کر کے دیکھ لے اور اسی بنا پر ابتدا میں خود نائب السلطنت کی حیثیت سے کام کرتا رہا مگر شاہجہاں نے داراشکوہ کی شکست اور گرفتاری کے بعد شجاع اور مراد کو ورغلا کر عالمگیر کے مقابلے کے لئے تیار کیا۔ عالمگیر ایک خط میں شاہجہاں کو لکھتا ہے۔

"ایں مرید سلوک را بہ نہجے مستحسن قرار دادہ بود و می خواست کہ بعد رفع شورش و استرضائے خاطر والا کمر اہتمام بر میانِ جاں بستہ بداں وسیلہ سعادت دارین حاصل کند و ہر چند شنید کہ موجب ارتفاع غبار فساد و برہم خوردگی مہامِ عباد تحریک آں حضرت است و برادراں بغرورِ آں دست و پا می زنند و جانے می کنند، اصلا گوش بسخنانِ مردم نینداختہ در اندیشۂ انحراف از شاہراہِ عقیدت نمی بود۔

---

[1] رقعاتِ عالمگیر ص ۲۱۳

لیکن از انجا کہ اخبار بے توجہیِ اعلیٰ حضرت بتواتر رسید
چنانچہ از نوشتۂ کہ بعبارت ہندی بہ شاہ شجاع قلمی گردیدہ بود
دخان وہاں اوبر سر آں خراب شدہ ہویدا است و یقین
حاصل شد کہ آں حضرت ایں مرید را نمی خواہند و با آنکہ کار از
دست رفتہ ہنوز تلاشِ آں دارند کہ دیگرے استقلال یافتہ
سعیِ ایں فدوی کہ سر و خفتر تمرد بیخ دین متین انتظام
ہماتِ مملکت است ضائع شود[1]۔"

اور خود شاہجہاں کے ذیل میں دئے ہوئے خط سے جو اس نے مراد بخش کو
لکھا تھا۔ یہ واضح ظاہر ہے کہ شاہجہاں نے مراد بخش کو کل ممالکِ محروسہ کی بادشاہت
عطا فرما کر عالمگیر کے قتل کرنے پر تیار کیا تھا۔

"بادشاہیِ کل ہندوستاں بطیب نفس و طوع
ضمیر بآں فرزند سعادت پیوند حوالہ نمودہ ایم، باید کہ دریں باب
کمالِ آگاہی بردباری بتقدیم رسانیدہ مطلقاً ایں رازِ سربستہ
را بہیچ کس از نزدیک و دور ظاہر نسازد، بعد از روزے
چند برادر را و برادر زادہ را بہ بہانہ ضیافت بخانۂ خود
طلب داشتہ کار ہر دو بہ پایاں رساند و خطبۂ ملک باسم و لقب خویش
مزین گرداند کہ من بر بنائے خاطر عہدۂ ایں امر خطیر را بآں فرزند
عقیدتمند سپردہ ام ایں کارِ عالی را از روئے کمالِ آگہی سر انجام
بخشد[2]۔"

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۲۱۸ [2] رقعات عالمگیر ص ۳۰۸

نتیجہ یہ ہوا کہ شجاع، اورنگ زیب اور مراد بخش کا اتحاد ثلاثہ ختم ہوگیا۔ شجاع پٹنہ سے خروج کرکے اورنگ زیب پر حملہ آور ہوا اور مراد بخش بھی باوجود کمال ارتباط کے جو اسے اورنگ زیب سے تھا اس کی مخالفت اور مقابلہ پر کمربستہ ہوگیا اور اسے بھی مجبوراً ان دونوں کے خلاف تلوار اٹھانا پڑی۔

یہی وجوہ تھے جن کی بنا پر وہ شاہجہاں کو آزاد کرکے حکومت سونپنے سے معذور رہا، اگر اسے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ دوبارہ اقتدار حاصل ہونے کے بعد شاہجہاں اسے نقصان نہ پہونچائے گا تو اس کی دینداری اور زہد و تقویٰ سے پوری امید تھی کہ وہ اپنے باپ کو داراشکوہ کی قید سے آزادی دلاکر پھر مطلق العنان بنادیتا اور اسی غرض کے لئے وہ آیا ہی تھا۔

شاہجہاں کی نظر بندی کے زمانہ میں عالمگیر نے جو خطوط اس کو لکھے ہیں اُن میں سے بعض اوپر نقل کئے گئے ہیں ان میں پورا ادب و احترام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور شاہجہاں کے سخت خطوط کا جواب بھی اس نے مودبانہ اور فدویانہ انداز میں دیا ہے اور کبھی کوئی سخت فقرہ اس کو نہیں لکھا۔ انہیں وجوہ سے شاہجہاں نے بالآخر اس کی خطائیں معاف کردی تھیں۔

شاہجہاں کے سابقہ طرز عمل سے وہ بے حد خائف تھا اور جیسا کہ اُس نے اپنے خطوط میں لکھا ہے وہ حاضر خدمت ہوکر قدم بوسی حاصل کرنے کا آرزومند تھا مگر شاہجہاں کے خدام اور قلعہ کے اہلکاروں سے اُسے خطرہ تھا کہ مبادا شاہجہاں کی تحریک پر وہ اس پر حملہ نہ کردیں اس لئے معذور رہا اس نے متعدد بار اپنے خطوط میں شاہجہاں سے درخواست کی کہ اس کی خدمت میں حاضر ہونے کی حالت میں اُسے اجازت دی جائے کہ وہ اپنے معتمد اہلکار وہاں متعین کرکے اپنی حفاظت کے انتظام کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہو مگر شاہجہاں نے یہ منظور نہ کیا۔ وہ چاہتا تو

ایسے مشکوک لوگوں کو قلعہ سے زبردستی خارج کرسکتا تھا مگر محض شاہجہاں کی دل شکنی کے خیال سے اس نے ایسا نہیں کیا شاہجہاں کو لکھتا ہے۔

"للہ الحمد والمنۃ ایں نیاز سند درگاہ شہنشاہِ بے مثال و بے مانند از بدو امتزاز روائح عقل و تمیز الی الآن باندازہ بشری و طاقت انسانی در تمہیدِ قواعدِ ارادت و اعتقاد و تشئید مبانی صدق و سداد خود را مقصر نساختہ در ضبطِ سر رشتہ استرضائے خاطرِ ہمایونی کوشیدہ از صراطِ مستقیم عبودیت و جانفشانی انحراف جائز نداشتہ و نمی دارد و در راہِ بندگی و عقیدت ثابت قدم و راسخ قدم است لیکن از مرِ این مقدمات کہ بنابر ارادتِ ازلی و مشیت لم یزلی درمیان آمدہ بمقتضائے طبیعت بشری مغلوبِ واہمہ و ہراس گشتہ جرأت آں نماندہ کہ باطمینان قلب و جمعیت باطن عازم امر از سعادت حضور پرنور تواند شد و الا آرزوئے خاطرِ فاطر ایں مستمند سراپا ارادت و اخلاص بہ نیل دولت اسلام سدۂ سپہر احتشام زیادہ از اں است کہ حوصلۂ تقریر و تبیین آں را برتابد و زبان ارادت از شکرانۂ عنایات سرشار و مراحم و اشفاقِ بے شمارِ اقدس قاصر الرائین مرید نوازی و امر عی فرمودہ حکم والا اشرف نفاذ رسانند کہ بعضے از مردم ایں مرید شت بقلعہ باریافتہ بجائے

جمعے از ملازمان سرکار عالم مدار کہ بمحافظت دروب و
مداخل مامور اند قرار گیرند واز پیش گاہ عنایت خسروانی
بحراستِ ابواب قلعہ امتیاز و اختصاص یابند ایں فدوی
را انسپار بجمیع خاطر و سکونِ باطن و اطمینان دل بحضورِ
اقدس رسیدہ سعادت زمیں بوس اشرف حاصل نماید
وزبانِ عقیدت بیان بعذرِ تقصیرات بکشاید غایت مرید نوازی
خواہد بود" [1]

وہ تمام عمر شاہجہاں کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرنے کے لئے تیار
تھا، اور اس نے شاہجہاں کی بقیہ زندگی بھر اس کا انتہائی ادب و احترام
کیا۔ اور اسے آرام پہونچانے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہا اسی وجہہ سے
شاہجہاں نے اس کو معاف کر دیا تھا اور اس سے خوش ہو گیا تھا جیسا ذیل کے
خط سے ثابت ہوگا۔

"بعد ادائے وظائفِ عقیدت بعرض اقدس اعلیٰ
می رساند، والا فرمانِ عاطفت عنوان کہ در جواب عریضہ
ایں مرید صادر شدہ بود، در اسعد ساعات عزّ ورود
ارزانی داشت واز وصولِ نوید عفوزلات و تقصیرات
جہاں نشاط و انبساط اندوختہ بلطف عمیم مرشدِ خطا بخش
عذر پذیر امیدوار تر گردید، المنۃ للہ تعالیٰ کہ اعلیٰ حضرت
بمقتضائے انصاف و قدردانی عفو را بر انتقام ترجیح
دادہ ایں سراپا گناہ را از گردابِ اندوہ و ملال نجات
بخشیدند، رجا بکرم ایزدانی است کہ بعد

[1] رقعات عالمگیر ص ۲۰۶۔

بہ موجب مصلحت امرے کہ وقوع آں نشاید بظہور نیاید۔"

ایں مریدکہ خلاصۂ عمرِ را صرفِ رضا جوئی دینکو خدمتی نمودہ بجہت مزخرفاتِ فانیۂ دنیویہ چگونہ راضی می تواند بود کہ اوقات فرخندہ سماتِ اعلیٰ حضرت کہ جان ومال فرزندان واہل وعیال فدائے تحصیل خرسندی حضرت است۔ بجمعیت نگزرد ومردم محل از خدمت وانی سعادت جدا باشند[1]"

مگر انتظامی مصالح کے پیشِ نظر اُسے بادشاہ کا لقب اختیار کرنا پڑا جیسا کہ وہ خود شاہجہاں کو لکھتا ہے۔

"خدائے غیب داں کہ او را بکذب ودروغ گواہ گرفتن نزد اہل اسلام کفر و در جمیع ملل وادیان مذموم است می داند کہ ایں مرید ہرگز بہ تجویز وارتکاب خلاف مرضی طبع مقدس راضی نبودہ ونیست خود را نائب حضرت انگاشتہ بریں خدمت قیام می نماید لیکن چوں انتظام اوضاع مملکت واحوالِ رعیت باظہار نیابت امکان نداشت۔ ناگزیر برائے پاس مصالح ملک وملت روزے چنداں ایں نوع سلوک کہ بخاطر خطور نمی کرد وچہ شرمندگی ہا کہ ازاں رہگذر ندارد ولازم شد، پس از آنکہ امنیت در ممالک پدید آمدہ، غبار فتنہ وفساد فرو نشیند انشاء اللہ تعالیٰ جمیع مرغوبات

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۲۱۶

خاطر اشرف بوجہ احسن صورت خواہد گرفت[1]"

پھر ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے۔

" بررائے خورشید ضیا پوشیدہ نماند کہ ایں مرید مگر را بحضرت والا عرضداشت نمودہ اکنوں نیز کہ حرف واشدہ برزبان قلم می آورد کہ قبول ایں منصب خطرناک کہ اندیشۂ مخاطرات آں ہوشمندانِ عاقبت بیں را جگرخوں دارد اختیاری نیست وبخواہش ایں بندہ نبودہ چہ صاحب عقل سلیم وفطرت مستقیم کہ ایمائے بازخواستِ اخروی دارد، چگونہ باختیار راضی تواند شد کہ باآں کہ شرط عدالت میان قوی دا عضائے خویش مرعی داشتن درکمال صعوبت است، وزر ومالِ عالمے را بگردن بگیرد وجواب یوم الحساب را آمادہ گردد، بلکہ چوں مہماتِ مملکت موروثی از نسق افتادہ طبقاتِ انام پامالِ حوادث می شدند واحکام اسلام ازمیاں برخاستہ بود، ایں مجبورِ قضاء قدر از روئے اضطرار بریں شغلِ خطیرتن در دادہ اظہار بعض رسوم جہانداری کہ پیش رفت کار بے آں دشواری می نمود لازم دید[2]۔"

عالمگیر نے دوران بادشاہت نہایت محتاط زندگی گذاری، قرآن شریف کی کتابت کرتا تھا۔ ٹوپیاں سیتا تھا اور اسی کی اجرت سے اپنی ضروریات زندگی

---

[1] رقعات عالمگیر ص ۲۱۶ [2] رقعات عالمگیر ص ۲۲۵

پوری کرتا تھا۔ بادشاہت کا عیش و آرام اس نے بالکل حاصل نہ کیا۔ اپنی ساری
زندگی خدمت خلق و خدمت دین میں بسر کی اس لئے اس کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ
اس نے دارا شکوہ سے دین کے لئے اور پھر اپنے باپ شاہجہاں کو اس قید سے
آزادی دلانے اور خود اپنی اور اپنے بھائی شجاع اور مراد بخش کو اس کے
شر سے بچانے کے لئے جنگ کی اور اس کو اپنا فرض سمجھا کہ اس کو دفع
کرکے دین کو بچائے باپ کو آزادی دلائے اور خود اپنے کو اور دیگر بھائیوں
کو ہلاکت سے بچائے۔

تقریباً انگریزوں کے اقتدار حاصل کرتے ہی عالمگیر کے خلاف ایک
شدید پروپیگنڈا شروع ہوا۔ اور اس کے معائب و مظالم اور ہندوؤں
کے خلاف تعصب کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات رنگین کئے گئے۔ مگر یہ
حقیقت ہے کہ شاہجہاں عالمگیر اور اس کے بھائیوں کے خطوط نے شائع ہو کر
سارے بدنما داغوں کو اس کے چہرے سے مٹا دیا۔ اور اب مسلمان بادشاہان
ہندوستان میں اس کو امتیاز کا ایک ایسا تاج حاصل ہو گیا ہے جو ابد الآباد تک
اس کے سر پر دمکتا اور اس کے کردار کے چہرے کو جگمگاتا رہے گا۔

عالمگیر کے ترکستان اور ترکوں سے تعلقات

(از محمد روحی اویغور کاشغری)

ترکستان کی یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو لوگ خواہ اس کی وجہ کچھ ہی کیوں نہو جب ایک مرتبہ ترکستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے ان کو دوبارہ اپنے آبائی وطن کو واپس لوٹنا نصیب نہ ہوا حکمراں ہو، والی ہو، جنرل ہو یا کوئی جماعت ہو جو گئے وہ دوبارہ واپس نہ لوٹے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ترکستان کو مرکز قرار دے کر ممالک مفتوحہ پر اپنا کنٹرول رکھ سکے، جیسے چنگیز، اس کی اولاد اور تیمور وغیرہ۔ ترکستان کی تقدیر میں یہ کرشمۂ قدرت پرانے زمانے سے لے کر آج تک ایک روایتی حیثیت رکھتا ہے۔

تازہ تحقیقات کے مطابق آزیانا قوم کا آبائی وطن یعنے آریانا ویجو "ترکستان کے برخانی علاقے اور خاص کر قرغز سٹپ اور اس کے اردگرد تھا وہ لوگ اس علاقے کو ایک مرتبہ چھوڑنے کے بعد واپس نہ لوٹے۔ البتہ اس قوم کے کچھ لوگ جو وہاں رہ گئے تھے ان کے اخلاف اب بھی ترکستان میں کہیں کہیں نایاب آجاتے ہیں اسکیتھون یا سقا، اس کے بعد یوچی یا کوشانی یا متعاقباً جو لوگ ھیطل یا "سفید ہون" کے نام سے معروف ہیں۔ بالآخر اسلام کے بعد ترک ایک اور آخر میں بابر کے خاندان کی تقدیر میں بھی یہی کرشمۂ قدرت کارفرما رہا ہے۔ یہ سب لوگ ترکستان سے ایک مرتبہ نکلنے کے بعد واپس نہ لوٹے بلکہ یہ لوگ جہاں بھی گئے وہاں کے

لوگوں میں گھُل مل کر اسی ملک کو اپنا لیا اور اسی وطن کے لئے جئے، اسی وطن کے لئے لڑے اور اسی وطن کے لئے مرے۔

بابر بھی جب اپنے حریفوں سے شکست کھانے کے بعد ترکستان سے نکلا تو اس نے تین مرتبہ کوشش کی کہ وہ وہاں واپس جاکر اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی اور پھر اُسے مجبوراً ترکستان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا اور اس کے خاندان، ہمایوں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کسی نے اپنے آبائی وطن جانے اور دوبارہ قیام کرنے کا کوئی اقدام نہیں کیا۔ بلکہ وہ شروع ہی سے اس برصغیر کو اپنا وطن قرار دے کر اس وطن کے لئے جیئے اور اسی کے لئے مرے۔ مگر ان تمام حالات کے باوجود ان کے ترکستان اور ترکوں سے تعلقات کلی طور پر قطع نہیں ہوئے بلکہ بابری خاندان نے ترکستان سے تعلقات کو خاص طور پر اہمیت دی اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات کے علاوہ سیاسی اور ثقافتی تعلقات بھی آخر تک جاری رہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ خود بابر نے اپنا توپ خانہ بنانے کے لئے ترکی سے توپ بنانے والے ماہروں کو بلایا تھا اور ایک روسی ماخذ کے مطابق بابر نے اپنے پایہ تخت آگرہ سے ایک ایلچی ماسکو بھیجا تھا۔ (S.M.IKRAM , Cultural Heritage of Pakistan P-9) ظاہر ہے کہ یہ ایلچی وسطی ایشیا سے ہو کر ماسکو پہونچا تھا۔ بہرحال بابر نے ترکستان سے اپنے تعلقات کو قطعی طور قطع نہیں کیا تھا بلکہ اس کے بہت سے مخلص وفادار دوست، علماء وشعراء، ترکستان سے آگرہ پہونچکر اس کی خدمت میں شامل ہوتے رہے۔ اور کابل اور ترکستان کے تازہ میوے اور غزنی کی اعلیٰ شراب منظم طور پر آگرہ پہونچتی تھی۔ (دیکھو تزک بابر)

اگرچہ ہمایوں کو یہ فرصت نہ ملی کہ ترکستان سے سیاسی تعلقات کو بحال رکھے

لیکن جیسا کہ ہرات و ایران سے اس کے ثقافتی تعلقات تھے اسی طرح ترکستان سے
بھی اس کے قریبی ثقافتی تعلقات رہے ہیں۔ (ابوالفضل اکبر نامہ ص ۲۲۱ و نیز دیکھو
فرشتہ) اور بہت سے ترکستانی علما اور شعرا اس کے دربار سے منسلک رہے ہیں اسکے علاوہ
سلطان سلیمان قانونی کا ایک کپتان امیر البحر سیدی رئیس جب سمندری طوفان
اور پرتگیزوں سے مقابلے کی وجہ سے اپنے جہازوں کے ایک حصہ سے محروم ہو گیا
اور باقی ماندہ جہازوں کو لے کر گجرات کے ساحل سے ہو کر سندھ کے راستے سے
دہلی تک پہونچا اور کئی مہینوں تک ہمایوں کے پاس رہا۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے
اسطرلاب سازی، تنظیم محاسبات، کسوف و خسوف کے حالات، سیر کواکب، علم نجوم
و فلکیات اور جغرافیہ کی تعلیم میں اس کی بڑی مدد کی۔ سیدی رئیس کا بنایا ہوا اسطرلاب
اسطرلاب ہمایونی کے نام سے بڑا مشہور ہے۔ (اکبر نامہ ص ۲۲۱) اور اس کے علاوہ
ہمایوں کی طرف سے ایک مراسلہ کابل سے سید احمد شاہ سفیر کے ذریعہ سلطان سلیمان
قانونی کے نام ۱۰ رمضان ۹۵۵ھ / ۱۵۴۸ء کو بھیجا گیا جس کا اصل نسخہ "توپ قاپی سرائے"
استنبول میں موجود ہے۔ جس کے ڈاکٹر خیر اللہ ادرس نے اس سال کے اوائل میں
اس مراسلہ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی جناب ممتاز حسن صاحب مینیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک
آف پاکستان کو پیش کی ہے۔

اکبر کے زمانے میں بھی ترکستان سے قریبی سیاسی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات
قایم رہے ہیں۔ اور بہت سے ترکستانی علماء، شعراء اور خطاط نے اکبر کے علم پرور
دربار سے وابستہ رہ کر اس کے دربار کو رونق بخشی، نہ صرف یہ بلکہ برِ صغیر اور ترکستان کے
لوگ ایک دوسرے کے ملک میں ہونے والے واقعات سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ
رہ سکے۔ چنانچہ جب اکبر نے دینِ الٰہی کا رواج دیا اور اس کے معتقدات کی شہرت
ترکستان تک پہونچی تو والئ ترکستان عبداللہ خاں ازبک نے ایک سفارتی وفد

اور مراسلے کے ذریعہ اکبر کو ملامت کی اور اکبر نے اس کی تردید میں ایک مکتوب کے ساتھ میراں صدر اور حکیم کو سفیر بناکر عبداللہ خاں ازبک کے پاس بھیجا اور اپنے جوابی مراسلہ میں یہ اشعار لکھے۔

قیل ان اللہ ذو ولد　　　قیل ان الرسول قد کہنا
ما نجا اللہ والرسول معا　　　من لسان الوریٰ فکیف انا

(آئینہ اکبری۔ ترجمہ بلوخ مین ص ۵۱۲)
(مکاتیب ابو الفضل طبع نول کشور ص ۴، ۲۶)

تاریخ سید راقم بخاری ۱۰۱۳ھ (نسخہ خطی)، و نیز علی والہ داغستانی (ریاض الشعراء) کی روایت کے مطابق اکبر اور عبداللہ خاں ازبک بادشاہ بلخ و بخارا کے درمیان ابن باعی مستزاد کا بھی تبادلہ ہوا ہے۔

اکبر

عمرم ہمہ در فراق و ہجراں بگذشت　　　با درد و الم
ایں عمر گراں مایہ چہ ارزاں بگذشت　　　با غصہ و رنج
عمرے کہ نشد صرف سمرقند و حری　　　با عیش و طرب
افسوس کہ در آگرہ ویراں بگذشت　　　با محنت و غم

عبداللہ خان ازبک

مرغ ہوست ہمیشہ بے بال و پر است　　　در خود مستیز
دریائے وجود عقل تو بے گہر است　　　از دے برخیز
در شہر سمرقند و حری شیر انند　　　اے خام طمع
در آگرہ و لاہور ترا صد خطر است　　　زنہار گریز

(سید حسام الدین راشدی، مقالات الشعراء ص ۹۰ حاشیہ نمبر ۳ بزم تیموریہ، سید

صباح الدین - ص ۵۸ -

اگرچہ تذکرہ مقالات الشعراء میر علی شیر قانع تتوی ص ۹۱۴ چاپ جناب سید حسام الدین راشدی ۱۹۵۷ء میں اس مستزاد کو جسے سید راقم بخاری اور علی دالہ داغستانی نے اکبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ بابر سے نسبت دی ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ عبداللہ خاں ازبک بابر کا معاصر نہیں، بلکہ اکبر کا معاصر تھا حقیقت جو بھی یہ ثابت ہے کہ بابری خاندان اور ترکستان کے والیوں کے درمیان اس دلچسپ مستزاد کا تبادلہ ہوا ہے۔

شاہجہاں کے ترکی سے تعلقات

تاریخ سلحدار (جلد اول ص ۱۴۳) میں باب عالی کی طرف سے شاہجہاں کے دربار میں فرستادہ ایک سفیر بنام معانزادہ حسین آغا کی ۱۰۶۹ھ میں استنبول کو واپسی کا ذکر ہے۔ جو شاہجہاں کے فرزند سلطان مراد بخش کی طرف سے ایک مراسلہ مع ہدایا و تحائف کے لایا۔ جس میں ۶۴ قراطی ایک ہیرا بھی شامل تھا۔ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب مراد بخش نے جو گجرات کا والی تھا ۱۶۵۷ء دسمبر کے مہینے میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا اور ۱۶۵۸ء اپریل کے مہینے میں اورنگ زیب کے ساتھ مصالحت کر کے بالآخر اپنے بھائی کی طرف سے اسی سنہ میں محبوس کیا گیا اسی دوران میں ترکی سفیر نے شہزادہ مراد بخش سے ملاقات کی تھی اور یہ مکتوب اسی وقت حاصل کیا گیا۔ (حکمت بایور۔ ہندستان تاریخی جلد ۲ ص ۲۵۰)

شاہجہاں کے ترکستان سے تعلقات کے بارے میں شاہجہاں نے ۱۶۴۶ء میں مراد بخش کی زیر نگرانی اور قیادت میں اور ۱۶۴۷ء میں شہزادہ اورنگ

زیب کی قیادت میں بلخ و بدخشاں جو والی بخارا نظر محمد خاں کے زیرنگیں تھے، کو فتح کرنے کے لئے فوج روانہ کی۔ اور عبدالحمید لاہوری کی روایت کے مطابق بلخ و بدخشاں کو فتح کرنے کا مقصد اپنے آبائی وطن، تیموری خاندان کے قدیم پایہ تخت "عرش نشان" سمرقند کو فتح کرنے کا راستہ ہموار کرنا تھا۔ لیکن خواہ مراد بخش ہو یا اورنگ زیب کسی نے آمو دریا کے اُس پار گذر نے کی کبھی ہمت نہیں کی۔ (ڈاکٹر سید معین الحق - جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی - جلد ۱ ص ۱۹ بحوالہ عبدالحمید لاہوری - ص ۴۸۲)

اورنگ زیب کے ترکستان سے تعلقات

جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو اس کے زمانہ میں ترکستان یعنی بخارا۔ اورگنج۔ کاشغر۔ بلخ اور دوسرے اسلامی ممالک سے نہ صرف سیاسی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات قایم رکھے گئے بلکہ اس قسم کے تعلقات کو اور ان ممالک کے اندرونی حالات سے باخبر رہنے کو بڑی اہمیت دی گئی۔ خاصکر برصغیر اور ترکستان کی مذکور ریاستوں کے درمیان بڑی تعداد میں سفیروں کا تبادلہ کیا گیا۔ عالمگیر کی تخت نشینی پر مبارک باد دینے کے لئے ترکستان کا پہلا سفیر بلخ کے والی سبحان قلی خاں کی طرف سے ابراہیم بیگ نامی ایلچی اور بخارا کے والی عبدالعزیز خاں کا سفیر خوجہ احمد پہونچا۔ ۱۶۶۳ء میں عالمگیر کی طرف سے ان سفیروں کے جواب میں مصطفیٰ خاں کو بہت سی ہدایا و تحائف کے ساتھ سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ یہ سفرا اپنے ساتھ بہت قیمتی تحائف اور مراسلے بھی لائے تھے۔ مگر عالمگیر کے مورخین نے ان مراسلوں کے متن نقل نہیں کئے۔

بخارا سے آئے ہوئے سفیر

بخارا سے مذکور خوجہ احمد کے بعد دو اور سفیر عبداللہ بیگ ۱۶۶۷ء میں اور

رستم بیگ بھی اسی سال عالمگیر کے دربار میں پہونچے۔ ۱۶۷۰ء میں عالمگیر کی طرف سے یکتاز خاں نام کا ایک سفیر بخارا بھیجا گیا۔ ۱۶۷۱ء میں محمد شریف ۱۶۷۶ء میں خوجہ نعمت اللہ۔ ۱۶۸۱ء میں رحمان قلی۔ ۱۶۹۰ء میں بدر بیگ (یا نذر بیگ) اور ۱۷۰۱ء میں قطب الدین خاں نام کے سفیر والئی بخارا کی طرف سے سفارتی مشن پر عالمگیر کے دربار میں پہونچے۔ (مآثر عالمگیری۔ ترجمہ جدوناتھ سرکار ص ۴۱-۶۴-۶۶، ۱۳۳، ۱۴۰، ۲۰۳، ۲۲۱۔ حکمت بایور ہندستان تاریخی۔ جلد ۲ ص ۴۶-۲۴۵)

عبداللہ بیگ اور خوجہ نعمت اللہ کا حکمت بایور نے ذکر کیا ہے مآثر عالمگیری (انگریزی ترجمہ) میں انکا ذکر نہیں ہے۔

بلخ سے آئے ہوئے سفراء

مذکور ابراہیم بیگ کے بعد ۱۶۶۷ء میں خوشی بیگ یا خوشحال بیگ نام کا سفیر عالمگیر کے دربار میں پہونچا ہے۔ (عالمگیر نامہ ص ۱۰۵۰) ۱۶۶۹ء میں شادمان خوجہ۔ ۱۶۷۶ء میں ملا محمد طاہر۔ عالمگیر کے مشہور محتسب ملا عوض وجیہہ الدین کا بھائی۔ دونوں ۱۶۷۰ء میں عالمگیر کی طرف سے ترکستان بھیجے ہوئے سفیر کے ساتھ آئے۔ ۱۶۸۰ء میں سبحان قلی خاں کا اتالیق نظر بیگ اور قلندر بیگ بلخ کی طرف سے عالمگیر کے پاس سفیر کی حیثیت سے پہونچے۔ ان دونوں کا راستہ میں بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ اول الذکر کو کابل کے خزانے سے پانچ ہزار ۵۰۰۰ روپے اور لاہور کے خزانے سے بھی اتنی ہی رقم، اور آخر الذکر کو ایک خلعت، ایک خنجر اور ایک ہزار روپیہ نقد دیا گیا۔ (مآثر عالمگیری ص ۱۱۹)

اس کے بعد ۱۷۰۴ء میں یعنی چوبیس سال کے بعد بلخ سے خوجہ زاہد نام کا ایک

سفیر پہونچتا ہے (حکمت بابور ماخذ مذکور ص ۲۴۶)

اورگنج کی ریاست سے آئے ہوئے سفیر

۱۶۶۲ء میں اورگنج کے والی محمد خاں کی طرف سے دیوان بیگی اشم بیگ اور ۱۶۷۰ء میں اورگنج کے والی انوشہ خاں کی طرف سے صوفی بہادر اور ۱۶۸۱ء میں خان مرزا مذکور انوشہ خاں کی طرف سے سفیر بن کر آئے۔ (حکمت بابور صفحہ ۲۴۶) مآثر عالمگیری (ص ۸۴) میں صوفی بہادر کے نام سے ایک امیرِ کاشغر سے عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے آنے کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی صوفی بہادر ہو جو پہلے کاشغر پہونچا اور اس کے بعد عالمگیر کی خدمت میں پہونچا ہو۔ چنانچہ ناشر مآثر عالمگیری آغا احمد علی نے ان دونوں کو ایک ہی آدمی قرار دیا ہے۔ (دیکھو حکمت بابور مذکور ماخذ ص ۲۴۶ اور نوٹ نمبر ۲)

کاشغر سے آئے ہوئے سفرا

۱۶۶۳ء میں عبداللہ خاں والئی کاشغر کی طرف سے حاجی فولاد عالمگیر کی خدمت میں پہونچا۔ ۱۶۶۵ء میں عالمگیر کی طرف سے خوجہ اسحاق ایلچی کی حیثیت سے کاشغر بھیجا گیا۔ لیکن وہ وہاں کے انتشار کی خبر سُن کر راستہ ہی سے واپس لوٹ آیا۔ (عالمگیر نامہ ص ۴-۹۰۳) جب عبداللہ خاں والئی کاشغر اپنے ظلم و ستم اور شکاکی کی وجہ سے تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوا تو وہ کشمیر کے راستے مکہ جاتے ہوئے دہلی پہونچا تو عالمگیر کی طرف سے کشمیر سے لے کر دہلی تک راستہ میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اور اس مقصد کے لئے کشمیر اور لاہور کے گورنروں میں سے ہر ایک کو ہزار ہزار روپے کی منظوری دیدی اور اس کی

شاندار پذیرائی کیلئے ہدایات بھی دی گئیں جب وہ دہلی پہونچا تو اسکی بڑی آؤ بھگت کی گئی اور
گیارہ لاکھ روپیہ نقد، بیس ہزار روپیہ جنس، اٹھارہ گھوڑے، جواہرات، سونے اور چاندی سے
سجے ہوئے جھولوں کے ساتھ طلا کاری کئے ہوئے گھوڑوں کے پوش تحفہ میں دیئے اور بیگم صاحبہ کی طرف سے
بیس ہزار روپیہ، اٹھارہ تھان کپڑا، جواہرات سے مزین ایک خنجر، جواہرات سے جڑا ہوا پاندان اور سونے کی سینی تحفہ
میں دی گئی۔ اور عبداللہ خاں کی دلجوئی اور تفریح طبع کے لئے بہت سے تفریحی وسائل بھی فراہم
کئے گئے (مآثر عالمگیری مذکور۔ ص ۴۶-۴۵م)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالمگیر کی ترکستانیوں سے کتنی دلچسپی
تھی۔ عبداللہ خاں جب حج کرنیکے بعد ہندوستان لوٹا تو پھر اس کی بڑی عزت کیگئی۔ اور کشمیر میں
اس کے رہنے کا خاص انتظام کیا گیا اور آخر وقت تک وہ وہیں رہا۔ (حکمت بابور۔ ص ۲۲، بحوالہ
مآثر عالمگیری۔ ص ۶۳، ۷۱، ۷۵، ۱۰۵، ۱۴۳)

اس سے پہلے ۱۶۶۰ء میں جب عبداللہ خاں کاشغر کے تخت پر برقرار تھا اس کے بھائی منصور اور
بھتیجے مہدی نے جو عبداللہ خاں کی طرف سے خوفزدہ ہو گئے تھے عالمگیر کے دربار میں پناہ لی تھی جہاں انکا
بڑے اعزاز سے استقبال کیا گیا تھا۔ عبداللہ خاں کا لڑکا "یولبارس خاں" جب اسکا جانشین ہوا
تو اسکی حکومت کے دوران ۱۶۶۹ء میں عبدالرشید اس کے بعد ۱۶۸۳ء میں ایوب بیگ اور ۱۶۹۰ء میں عبدالرحیم
بیگ سفیر کی حیثیت سے عالمگیر کے پایۂ تخت میں پہونچے۔

اس یولبارس خاں کو مآثر عالمگیری، عالمگیر نامہ حتیٰ کہ حکمت بابر نے بھی بولبرس اور بلبس لکھا ہے حالانکہ یہ
غلط ہے۔ صحیح نام یولبارس خاں ہے جسکے معنی "شیر" ہیں۔ بولبرس ترکی زبان کا کوئی لفظ ہے نہ ہی اسکے کوئی معنی ہیں
یہی یولبارس خاں اور اسکے بعد اسکا چچا اسمٰعیل سلطان بن عبدالرحیم خاں کاشغر میں سعیدیہ خاندان کے آخری سلاطین ہیں اور
آخرالذکر کے ساتھ یہ خاندان بھی ختم ہو جاتا ہے۔ (دیکھو ملا موسیٰ سیرامی تاریخ امینیہ (قلمی نسخہ) بزبان ترکی کاشغری ف ۳۰)

عالمگیر ترکستانی علماء کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور
ان کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا اور ترکستان
کے بعض علماء کی بہت خبر گیری کیا کرتا تھا۔ اور ان کو بے تحاشہ روپیہ

بھیجتا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مشہور ترکستانی عالم خواجہ عبدالغفار کی طرف سے جو مکتوب آتا تھا اس کے جواب میں ہزار روپے حتیٰ کہ بعض اوقات دس ہزار روپے بھیج دیا کرتا تھا۔ اور اس کے علاوہ ہندوستان کی بعض پیداوار بھی اپنے حساب میں بھیج دیا کرتا تھا۔ چنانچہ عالمگیر نامہ میں توران کے عالمگیر کے وظیفہ خور علماء اور مشائخ کی ایک لمبی فہرست بھی درج ہے۔

ترکستان اور ایران سے جو علماء ہندوستان آتے تھے عالمگیر کی طرف سے ان کی بڑے اعزاز کے ساتھ پذیرائی ہوتی تھی۔ چنانچہ سابق والئ ازبک نظر محمد خاں کا داماد اور ترکستان کا مشہور عالم خواجہ محمد یعقوب جب ہندوستان پہونچا تو اس کے لئے دس ہزار روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ (حکمت بابور۔ ماخذ مذکور ص ۲۲۸ بحوالہ مآثر عالمگیری ص ۱۴۰)

برنیئر نے اپنے سیاحت نامہ میں اورنگ زیب کی پانچ سالہ جنگ ختم ہونے کے بعد۔ ازبک اور بلخ کے حکمرانوں کی طرف سے دو سفارتی وفود کے آنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ ان سفیروں کے نام نہیں بتاتا۔ ممکن ہے یہ وہ دو سفارتی وفود ہوں جو پہلی مرتبہ والئ بخارا اور والئ بلخ کی طرف سے عالم گیر کی تخت نشینی پر مبارکباد دینے کے لئے پہونچے تھے۔ برنیئر کے بیان کے مطابق یہ دو سفارتی وفود اپنے ساتھ نہایت قیمتی تحائف جن میں قیمتی لعل سے بھرے ہوئے دو صندوق، لمبے بالوں والے اونٹ، بہت سے خوبصورت گھوڑے۔ اور کئی اونٹوں پر لدے ہوئے تازہ میوے، مثلاً سیب، ناشپاتی، انگور اور خربوزے وغیرہ لائے تھے۔ ان تحائف کے عوض سفارتی وفود کا عالمگیر کی طرف سے نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ اور ان کو سراپا دستار کمر بند پھول کڑھے ہوئے ریشمی کپڑے وغیرہ بطور تحفہ دئے گئے۔

برنیز ان سفارتی وفود کے بہت سے ارکین کا گندگی اور کنجوسی کی وجہ سے مرنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ہم برنیئر کے اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو آدمی ترکستان کے سرد اور خوشگوار آب وہوا کے علاقے سے ہندوستان آتا ہے اس ملک کی شدید گرمی اس کی ہلاکت کا باعث ہونے کے لئے کافی ہے۔ برنئیر لکھتا ہے کہ جو روپیہ عالمگیر کی طرف سے ان سفیروں کو بحیثیت مدد خرچ دیا جاتا تھا وہ اس کو خرچ نہیں کرتے بلکہ ذخیرہ اندوزی کر کے نہایت غربت کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے جو ان کی سفارتی شان کے خلاف تھی۔ شاید برنئیر نے ان ترکستانی لوگوں کی یورپین لوگوں کے برعکس سادہ اور بلا دبدبہ زندگی کو دیکھ کر یہ اشتباہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی ان کی سادہ زندگی کو دیکھ کر اظہار تعجب کرتا ہے۔ ان سفارتی وفود کی روانگی کے وقت بھی اورنگ زیب اور دوسرے امراء کی طرف سے ان کو بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکستان اور برصغیر کے درمیان تجارتی تعلقات نہایت اچھے تھے۔ ترکستان سے بہت سے تازہ اور خشک میوے۔ آلو بخارا، زرد آلو اور مختلف اقسام کے کشمش وغیرہ اموال درآمد کئے جاتے تھے۔ (دیکھو برنیئر ٹریولز ان دی مغل ایمپائر جلد اول ص ۱۱۶ و مابعدہا) یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس بیسویں صدی میں جبکہ وسائل حمل ونقل اور رسل ورسائل نے بڑی ترقی کی ہے۔ اور فاصلہ کی کوئی وقعت نہیں رہی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگ ترکستان کی ان نعم البدل نعمتوں سے محروم ہیں اور ان مملکتوں کے لوگ ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے ہیں۔

اورنگ زیب کے ترکی سے تعلقات

اگرچہ عالمگیر کی پچاس سالہ دور حکومت (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) میں برصغیر اور

دوسرے اسلامی ممالک خاص کر بلخ ، بخارا ، کاشغر اور ارگنج وغیرہ کے درمیان
بہت سے سفارتی وفود کا تبادلہ ہوا اور نیز شریف مکہ اور بصرہ جو کہ عثمانی سلطنت
کے صوبہ جاتوں میں سے تھے ان کے والیوں کے ساتھ قریبی تعلقات قایم رہے ہیں
چنانچہ والئی بصرہ حسین پاشا ۱۶۶۱ء میں ایک سفیر دہلی بھیجا اور ۱۶۶۹ء میں خود حسین
پاشا دہلی میں پناہ لینے آیا ۔ اور اعلیٰ منصب (پنج ہزاری) پر فائز ہوا ۔ خلف حسین
پاشا یحییٰ پاشا نے نیز ۱۶۸۱ء میں ہندوستان میں پناہ لی اس کے باوجود
عالمگیر کی پچاس سالہ دورِ حکومت میں سوائے احمد آغا کے جو کہ سلیمان دویم کی
طرف سے دہلی بھیجا گیا تھا عالمگیر کی طرف سے نامعلوم وجوہات کی بناء پر کوئی سفیر
ترکی نہ پہونچا ۔ (حکمت بایور ۔ بلیٹن نمبر ۵۴ ص ۲۶۹ اور ہندستان تاریخی جلد
نمبر ۲ ۔ ص ۲۵۰)

حکمت بایور کی رائے کے مطابق اس کی وجہ تیموریوں کا آلِ بایزید کے
مقابلے میں اپنے موقف کو بلند سمجھنا تھا ۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب عالمگیر اور ایران
کے تعلقات بگڑ گئے اور ایران کی طرف سے حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو ۱۶۶۲ء اور
۱۶۶۶ء کے درمیان عالمگیر نے عثمانی دربار کو ایک سفیر بھیجنے کا ارادہ کیا ۔ لیکن
اس ارادے کو نامعلوم وجوہ کی بناء پر عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا ۔ حکمت بایور کی
رائے میں اس کا سبب کوئی سیاسی سوجھ بوجھ یا اس کی تخت نشینی کے موقع پر
ترکی سے کسی کا نہ آنا تھا ۔ (حکمت بایور ۔ ماخذ مذکور ص مذکور) ہر حال میں
"اخبارات دربار معلیٰ" جو کہ عالمگیر کے دور سے متعلق ایک رسمی ریکارڈ ہے اور
اور جس کے بہت سے حصے رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور کچھ حصے ریاست جے پور کے
آرشیو میں موجود ہیں (دیکھو جے سرکار History of Aurangzib جلد ۳
ص ۱۱۸ فٹ نوٹ) جس میں ۱۶۶۶ء میں سلطان روم محمد چہارم کے

عہدِ حکومت میں عالمگیر کے شاہ خواجہ نام کے ایک سفیر کو بھیجنے کے ارادے کا ذکر ہے۔ لیکن نہ ہی عثمانی ماخذ میں اور نہ ہی عہدِ اورنگ زیب کے ماخذوں میں اس سفیر کے عملاً بھیجنے کا کوئی ذکر ہے۔ (حکمت بایور بٹین مذکور۔ ص ۲۷۰)

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سفیر بھیجنے کا ارادہ کیوں کیا گیا اور پھر اس ارادے کو ملتوی کیوں کر دیا گیا۔ اس کے وجوہات کا اندازہ لگانے کے لئے اس زمانے کے ایران اور ہندوستان کے تعلقات پر ایک نظر ڈالنی چاہئے۔ ان واقعات کی تفاصیل کے لئے دیکھو۔ (عالمگیر نامہ ص ۹۸۴، ۹۸۵۔ احکام عالمگیری۔ احکام ۵۱ منتخب اللباب جلد ۲۔ ص ۲۰۲۔ فیض القوانین۔ ص ۹۹، ۲۹۶ سرکار ہسٹری آف اورنگ زیب۔ جلد۔ ۳ ص ۱۱۰، ۱۱۳)

یہ وہ زمانہ تھا جب عالمگیر اور ایران کے صفوی خاندان کے شاہ عباس دوم کے درمیان تعلقات بگڑ چکے تھے۔ اور دونوں کے درمیان تہدید آمیز مکاتب کا تبادلہ ہونے لگا تھا تربیت خاں جو سفارتی مشن پر ایران بھیجا گیا تھا جب دسمبر ۱۶۶۶ء میں آگرہ لوٹا تو شاہ عباس دوم کی طرف سے ایک تہدید آمیز مکتوب بھی لایا۔ شاہ عباس نے اپنے اس خط میں عالمگیر پر الزام لگایا تھا کہ وہ کمزور ہے اور اس کی کمزوری کی وجہ سے مرہٹوں کا سردار کافر شیواجی طاقتور ہو گیا ہے۔ اور عالمگیر کا لقب اس کو زیب نہیں دیتا۔ وہ ایک غاصب ہے جو اپنے باپ کو قید میں ڈال کر اور تخت کے حقیقی وارثوں یعنی اپنے بھائیوں کو مروا کر ان کے حقوق کو غصب کیا۔ اور شریعت و عدالت کے راستے سے منحرف ہو گیا۔ شاہ عباس نے اپنے بارے میں لکھا کہ وہ شہنشاہ عالم پناہ ہے۔ ہمایوں کی مدد کر کے اس نے اس کا تخت اس کو واپس دوبارہ دلا دیا۔ اور ضعیفوں کی مدد کرنا اس کا شیوہ ہے۔

اگر عالمگیر کا موقف یہی رہا تو وہ ہندوستان پر بذات خود فوج کشی کر کے اس ملک کو فتنہ و فساد سے نجات دلانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شاہ عباس دوم نے نہ صرف اس خط کے لکھنے پر اکتفا کیا بلکہ اس نے بڑی تعداد میں فوج جمع کر کے اصفہان سے ہندوستان کی طرف یورش بھی کی جب عالمگیر کو ایران میں اپنے ملک التجار محمد صادق سے اس یورش کی خبر ملی تو اس نے بھی ایک بڑی سی فوج لے کر اس کے مقابلے کے لئے ہندوستان سے حرکت کی حتیٰ کہ دونوں طرف کی فوجیں ایران اور ہندوستان کی سرحد پر جمع ہونے لگیں لیکن اسی اثنار میں شاہ عباس دوم ایک ناگہانی مرض سے دوچار ہو کر مر گیا۔ اس کے مرنے پر جنگ اور تعلقات کے بگڑنے کا خطرہ ٹل گیا حکمت بایور کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں ایران کے خلاف ترکی سے مدد حاصل کرنے اور کم از کم اس کی دوستی حاصل کرنے اور ایران کے مغربی حدود میں شاہ عباس کو مشغول کرنے کے خیال سے عالمگیر نے اس سفیر کو بھیجنے کا ارادہ کیا ہو شاہ عباس کی ناگہانی موت سے جب خطرہ ٹل گیا تو سفیر بھیجنے کا ارادہ بھی ختم کر دیا گیا۔ (حکمت بایور۔ ماخذ مذکور ص ۲۷)

ترکی سے احمد آغا کی آمد

اس واقعہ کے بیس سال بعد سلطان سلیمان دوم کی طرف سے احمد آغا نام کا ایک سفیر مع مراسلہ کے ہندوستان بھیجا گیا۔ مآثر عالمگیری (ص ۲۰۳) میں قیصر روم کے سفیر احمد آغا کی آمد کا ذکر ہے یہ بھی مذکور ہے کہ احمد آغا۔ کاشغر کا سفیر عبدالرحیم بیگ اور بخارا کا سفیر نظر بیگ ایک ساتھ عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوئے اور مکاتب و تحائف پیش کئے۔ اور ان تینوں سفیروں کو انعامات سے نوازا گیا۔ اور ان کی اقامت کے دوران اور ان کی واپسی پر ان کو بشمول خلعتوں کے قیمتی جواہرات

گھوڑے، ہاتھی، نقود وغیرہ تحائف سے مالا مال کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان
ممالک کے بادشاہوں کی طرف سے بھیجے ہوئے تحائف کے بدلے میں ہندوستان
کے قیمتی کپڑے، جواہرات اور دوسرے قیمتی ساز و سامان بھی ان سفیروں کے
ہاتھوں بھیجا گیا۔ (عالمگیر نامہ مذکور ص ۲۰۳) لیکن ترکی ماخذ میں احمد آغا کا سفیر کی
حیثیت سے ہندوستان آنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تاریخ سلحدار اور تاریخ رشید
میں بھی سنہ ۱۰۹۳ھ اور سنہ ۱۱۵۶ھ کے درمیان جن واقعات کا ذکر ہے ان میں سفارتی مشن
کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نامہ دفتری میں بھی عالمگیر کے جوابی مراسلے کا متن موجود نہیں
ہے۔ حالانکہ ماثر عالمگیری میں عالمگیر کی طرف سے ایک جوابی مراسلہ بھیجے جانے کا
ذکر ہے (حکمت بایور بلٹن ص ۲۵۱ و ہندوستان تاریخی ص ۲۷۵ بحوالہ ماثر عالمگیری اس کا
ذکر انگریزی ترجمہ میں نہیں ہے) اور صرف اس سفارتی مشن سے متعلق کچھ اشارے باب
عالی کے آرشیو (یعنی قسمتِ خارجیہ ص ۱۰۸۱، ۱۳۸۰، تصنیف ابو الامین) میں ملتے ہیں، پہلا
نوٹ احمد آغا کا ذی الحجہ سنہ ۱۱۱۶ھ مطابق اپریل سنہ ۱۷۰۵ء میں مرنے کا ذکر اور اس کے لڑکے
محمد کی تنخواہ کے بارے میں ہے دوسرا نوٹ جو (صفر سنہ ۱۱۲۹ھ مطابق فروری سنہ ۱۷۱۷ء) میں
لکھا گیا۔ اس سفارتی مشن کے مہیا کئے ہوئے گھوڑوں اور انکے سفر خرچ کے بارے میں ہے۔
(حکمت بایور مذکور بلٹن ص ۷۶-۲۷۵) جو مراسلہ احمد آغا سلیمان دوم کی طرف سے لایا، نامہ
دفتری میں اس کی تاریخ اور دن واضح نہیں ہے۔ صرف ۱۰۰ یعنی (سنہ ۱۱۰۰ھ) لکھی گئی ہے
یہ سنہ ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۶۸۸ء سے لے کر ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۶۸۹ء کے مطابق ہے ماثر عالمگیری میں اس
مکتوب کا سنہ ۱۱۰۱ھ رمضان، مطابق جون سنہ ۱۶۹۰ء کے اوائل میں عالمگیر کو تقدیم کئے جانے کا
ذکر ہے۔ سلیمان دوم کا اس ایلچی اور سفیر کو بھیجنے کا مقصد سمجھنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا
چاہئے کہ اس زمانے میں ترکی اور ہندوستان کن حالات سے گذر رہے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب
آسٹریا نے مجارستان اور سربستان کو قبضہ کر کے صوفیہ کو تہدید کئے ہوئے تھے اور رومی لے

ایک بڑے حصّے کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ وینیس، مرادیا اور آتنہ کے ساتھ ملکر مرکزی یونانستان کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ حتیٰ کہ ڈلماچیہ اور بوسنہ تک پہونچ گئے تھے۔ اس کی وجہ سے سلطنت عثمانی کا موقف ایک نازک اور خطرناک مرحلے سے گذر رہا تھا اس کے برعکس جب عثمانی سفیر ۱۶۹۰ء میں ہندوستان کو روانہ ہوا عالمگیر کی سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عالمگیر نے بیجاپور کے حکمراں عادل شاہی جو سلطان محمد فاتح کا بھائی ہونے کا دعوی کرتا تھا، کی ریاست اور ترکوں کے آق قویونلو قبیلہ سے منسوب گولکنڈہ کے حکمراں قطب شاہی خاندان کو ختم کر کے ان دونوں ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ اسی طرح جنگجو مرہٹوں کو کچل کر ان کے اقتدار کو بھی ختم کر دیا تھا۔ کہنا یہ ہے کہ سارا ہندوستان اور افغانستان کا ایک حصّہ عالمگیر کے زیر نگیں آگیا تھا۔ (حکمت بایور۔ طبع مذکور ص ۲۷۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مراسلہ ان حالات کے تحت بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ مراسلہ کا لب ولہجہ حکمت بایور کی رائے کے مطابق عالمگیر کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اور بیشتر اپنی تعریف، ستائش اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اپنی عظمت جتانے اور جہاد پر ترغیب دینے پر مشتمل تھا اور اس کے علاوہ عالمگیر کا پورا نام اور اس کے رسمی القاب و عناوین کی رعایت بھی نہیں کی گئی تھی، اس کے باوجود ظاہری طور پر سفیر اور مراسلہ کو خاص اہمیت دی گئی۔ لیکن درحقیقت وہ سلطان سلیمان دوم کے اس مراسلے کے لب ولہجے سے ناراض ہوگیا تھا۔ شاید یہی سبب تھا جس کی بناء پر اس سفارت کے جواب میں اس نے ترکی کو کوئی سفیر بھیجنے کا ارادہ نہیں کیا۔ یہ مراسلہ جو آرشوِ صدرِ اعظم نمبر ۵۔ نامہ دفتری میں صفحہ ۱۵۹ سے صفحہ ۱۶۱ تک درج ہے۔

یہ مراسلہ قدیم کلاسیکی ترکی میں لکھا ہوا ہے۔ اس مراسلہ کا فوٹو طبع مذکور کے صفحہ ۲۷۰ کے بعد ملحق ہے۔

مُرشد قلی خاں کی مالی صلاحیت

پروفیسر عبد المجید صدیقی

مرشد قلی خاں دیوان دکن ہندوستان کی ان شخصیتوں میں سے تھے جن کا نام اور کارنامے مغل تاریخ کی زیب و زینت ہیں یہ ایک جلیل القدر امیر اور مدبر سیاست تھے۔ انہوں نے اورنگ زیب کی شہزادگی اور شہنشاہی دونوں موقعوں پر ان کا ساتھ دیا اور دل کھول کر مدد کی، ان کی فرض شناسی اور وفاداری ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ مرشد قلی خاں نے شمال اور دکن دونوں جگہ کام کیا تھا اور مغل شہنشاہیت کا وقار بڑھایا تھا۔ جنگ برادران میں یہ اورنگ زیب کے ہمرکاب تھے۔ اور مقدور بھر داد شجاعت دی تھی، دکن میں تو ان کی خدمات بے پایاں ہیں۔ جن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اور تاریخ ان خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مرشد قلی خاں یوں تو سپاہی آدمی تھے اور ان کے بزرگوں کا پیشہ سپاہگری تھا۔ لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب ان کو سیاست اور نظم و نسق کے میدان میں لایا گیا تو یہ سب سے زیادہ صاحب تدبیر اور معاملہ فہم ثابت ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رزم و بزم دونوں میدانوں کے مرد تھے۔ نظم و نسق کے شعبے کو انہوں نے اس طرح سنوارا جس طرح میدانِ کارزار میں وہ سپاہیانہ جوہر دکھاتے تھے مغل مورخ ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ "بہ کاردانی و معاملہ فہمی امتیاز تمام داشت[۱]" ہمیشہ ان کے ہر کام کی داد ملتی رہی اور اور یہ جہاں گئے آفریں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اورنگ زیب ان کے متعلق لکھتے ہیں

---

[۱] مآثر الامرا جلد سوم ص ۴۹۳

کہ "مرشد قلی خاں بندہ کار آمد درگاہِ معلی است - خدمت مرجوعہ از روئے امانت و دیانت بہ تقدیم رسانیدہ، در پرداخت مہمات بالا گھاٹ و آباد کاری دقیقہ از دقائق سعی و اہتمام فرو نگذاشتہ"[1]

مرشد قلی خاں ذات کے ترک تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بزرگ خراسان میں بس گئے تھے۔ اور اسی وجہ سے غالباً مرشد قلی خاں خراسان میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے مورخ ان کو خراسانی لکھتے ہیں۔ ان کا بچپن اور تعلیم و تربیت کا حال تاریکی میں ہے۔ اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم سپاہیانہ ہوئی تھی کیوں کہ ان کے بزرگ سب سپاہی پیشہ تھے۔ رہی ان کی عملی زندگی تو وہ قندھار سے شروع ہوتی ہے جہاں صفوی حکومت کی جانب سے علی مردان خاں قلعہ دار تھا۔ اس زمانہ میں قندھار اپنے حربی اور جغرافی محلِ وقوع کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ یہ ایرانی اور مغل حکومت کے درمیان مابہ النزاع تھا اس پر کبھی ایرانی حکومت قابض ہوئی تو کبھی مغل۔ اکبر اور ہمایوں کے عہد میں قندھار مغل سلطنت کے زیرنگیں تھا۔ لیکن ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۵ء میں اچانک صفوی اس پر قبضہ کر بیٹھے اور علی مراد خاں زیک کو اس کا قلعہ دار بنا دیا[2]۔ لیکن چند سال کے بعد شاہ عباس صفوی ثانی اس سے ناراض ہو کر اس کے درپے آزار ہو گیا۔ اس لئے علی مردان خاں ڈر کر مغل شہنشاہیت کا سہارا ڈھونڈنے لگا۔ اور بالآخر ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۸ء میں بعہد شاہجہاں علی مردان خاں نے قندھار مغل سلطنت کے حوالے کر دیا اور ہندوستان آ گیا۔ شاہجہاں نے اس خدمت کے صلے میں اس کو پہلے پنج ہزاری اور بعد کو ہفت ہزاری امراء کی صف میں جگہ دی اور امیر الامراء کے خطاب سے سرفراز کیا[3]۔ علی مردان خاں ہندوستان میں

---

[1] مقدمات رقعات عالمگیری بخیب اشرف ص ۲۰۱۔
[2] ماثر الامراء جلد دوم ص ۷۹۹۔ [3] ماثر الامرا جلد دوم ص ۷۹۹۔

تنہا نہیں آیا بلکہ اس کے حاشیہ کے دس افراد اور اس کے ساتھ ہندوستان آئے سا ادر مختلف خدمات اور اعزازات سے سرفراز ہوئے۔ منجملہ ان کے ایک مرشد قلی خاں بھی تھے[1]۔

چونکہ علی مردان خاں امیر الامرا کی دربار میں بہت عزت تھی اس سے مرشد قلی خاں کو بہت فائدہ پہونچا۔ کیوں کہ یہ علی مردان خاں کے خاص نوکر اور منظور نظر بھی تھے۔ اور انہوں نے ہی مرشد قلی خاں کی شاہجہاں سے سفارش کی اور شہنشاہ سے روشناس کرایا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہت جلد مرشد قلی خاں کی کارکردگی شہنشاہ کی نظر میں جچ گئی۔ اور یہ مختلف خدمات پر فائز کیے گئے۔ علی مردان خاں کے تقرب اور احسانات کی وجہ سے جو مرشد قلی خاں کو حاصل تھے آخر الذکر کو مورخ علی مردان خانی کہتے ہیں۔ اگرچہ مرشد قلی خاں کا نمایاں کام جس سے ان کو شرف دوام حاصل ہے دکن میں ہوا ہے لیکن ان کی پچھلی خدمات بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ ان کی مختصر سرگذشت یہ ہے کہ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں یہ پنجاب کے دیوان بنائے گئے تھے اور ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں ملتان کے دیوان ہوئے اور ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں توپ خانہ کے داروغہ اور کوتوال عسکر ہوئے اس کے بعد ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں فیل خانہ کے داروغہ ہوئے اور ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں دامن کوہ کانگڑہ کے فوجدار مقرر ہوئے۔ اور ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں جب عبدالعزیز خاں ازبک کے خلاف جو بلخ کو مہم بھیجی گئی اور شاہزادہ اورنگ زیب کو فوج کی کمان دی گئی تو مرشد قلی خاں کو بھی اس مہم کا بخشی بنا دیا گیا۔ جلوس شاہجہانی کے چھبیسویں سال ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء میں جب شاہزادہ اورنگ زیب کو دکن کا ناظم بنایا گیا تو مرشد قلی خاں کو بالا گھاٹ کا دیوان بنایا گیا اور ان کے منصب میں پانچ صدی کا اور اضافہ ہوا۔ اور خان کا خطاب عطا ہوا[2]۔

---

[1] ماثر الامرا جلد دوم ص ۴۹۸۔ [2] بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد دوم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دکن میں مرشد قلی خاں کا کام ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ اورنگ زیب کی دوسری صوبہ داری کا زمانہ ہے جو ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء تک جاری رہا۔ اسی صوبہ داری سے یہ مسلح ہو کر حصول تخت کے لئے آگے بڑھے تھے۔ پہلی صوبہ داری ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء سے شروع ہوئی تھی جو ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء تک جاری رہی۔ یہ صوبہ داری بے معنیٰ نہ تھی اس میں نہ صرف فتوحات ہوئیں بلکہ دکن کے نظم و نسق میں ڈھنگ پیدا ہوا۔ اگر یہ صوبہ داری برابر قایم رہتی تو دکن کو اور فائدہ پہونچتا۔ اور انتظامی الجھنیں نہ پیدا ہوتیں۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں اورنگ زیب اچانک شمال بلائے گئے اور خدمت سے معزول ہو گئے، اور ان کے جاتے ہی دکن کا نظم و نسق درہم برہم ہو گیا۔ اس وقت دکن کا صرف شمالی خطہ مغل حکومت کے زیر نگیں تھا۔ اور مغل نظم و نسق کے مطابق اس کے چار صوبے بنائے گئے تھے۔ اور یہ، خاندیش، احمد نگر برار اور دولت آباد کے نام سے موسوم تھے۔ اول الذکر تین صوبے تو شہنشاہ اکبر کے عہد یعنی ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء اور ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں فتح ہوئے تھے۔ اور آخری دولت آباد شاہ جہاں کے عہد میں ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں مسخر ہوا تھا۔ ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء کے بعد جب اورنگ زیب شمال چلے گئے تو یہ چاروں صوبے بے ہنگام ہو گئے۔ یہ جدید مقبوضات تھے اور ان پر کڑی نگرانی کی ضرورت تھی کہ حالات اور معاملات کو سمجھ کر نظم و نسق کے کل پرزوں کو متحرک کیا جائے۔ لیکن اورنگ زیب کے جاتے ہی یہاں بے طوریاں شروع ہو گئیں اور جو عہدہ دار اس خلا کو پُر کرنے کے لئے دکن بھیجے گئے تھے یعنی خان دوراں، جے سنگھ، اسلام خاں مشہدی، شاہنواز خاں، مراد بخش شائستہ خاں سب ناکام ہوئے۔ ان لوگوں کو دکن کے خاص حالات ہی سمجھنا مشکل تھا تو یہ معاملات کیا سلجھاتے، زراعت خراب ہوئی تو مالیہ بھی خراب ہو گیا۔ اور قحط کی بلائیں

(بقیہ نوٹ پچھلا صفحہ) ص ۱۷۷-۲۳۰-۱۷۱-۴۸۸ مآثر الامرا جلد سوم ص ۴۹۳-۴۹۴-

علیحدہ تھیں مغل تسلط کے ڈر سے کاشتکار گھر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اور کئی دیہات بے چراغ ہوگئے۔ اور جب اورنگ زیب ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء میں دوسری دفعہ ناظمِ دکن ہو کر آئے تو دکن میں اندھیر چھایا ہوا تھا۔ خود اورنگ زیب کے الفاظ میں " بہ سبب دست اندازی و غفلت صوبہ داران رعایا مستغرق گردیدہ و تمامی آں ولایت از انتظام و رونق افتادہ[1]"۔ ان بگڑے ہوئے حالات کو سلجھانا آسان نہ تھا۔ پہلے زراعت کو درست کرنا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ قرون وسطیٰ کی سلطنتوں کا دار و مدار اراضی کی آمدنی پر تھا۔ اسی ذریعہ آمدنی سے تمام سلطنتیں چلتی تھیں ان حالات میں سوائے اورنگ زیب کے دوسرا شخص اصلاح حال نہیں کرسکتا تھا اسی وجہ سے اورنگ زیب کو دوبارہ صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا۔

لیکن اب اصلاح حال کے لئے چند پختہ کار اور سمجھدار آدمیوں کی ضرورت تھی اورنگ زیب نے اس کام کے لئے دو عہدہ دار منتخب کئے ایک مرشد قلی خاں اور دوسرے ملتفت خاں اور یہ انتخاب اورنگ زیب ہی کا حصہ تھا۔ وہ بڑے مردم شناس حکمراں تھے۔ اچھے اور بُرے کو خوب پرکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے لکھا تھا " آدم خوب مثل طلائے بے غش است[2]"۔ یعنی اچھا آدمی کھرے سونے کے برابر ہے۔ مرشد قلی خاں کو بالا گھاٹ سپرد کیا گیا۔ جس میں ڈھائی صوبے یعنی احمد نگر، دولت آباد اور آدھا برار شامل تھے اور ملتفت خاں کو پائیں گھاٹ دیا گیا جس میں صرف ڈیڑھ صوبہ یعنی خاندیش اور آدھا برار شامل تھے۔ لیکن تین سال کے بعد پائیں گھاٹ بھی مرشد قلی خاں کو تفویض کر دیا گیا۔ کیوں کہ یہی اس کام کے لئے موزوں تھے اور اب یہ چار صوبوں کے دیوان ہو گئے اور سچی بات یہ ہے کہ ان صوبوں کا نظم و نسق اس قدر الجھا ہوا تھا کہ

۱۔ مقدمہ رقعات عالمگیری نجیب اشرف ص ۱۹۶

۲۔ مقدمہ رقعات عالمگیری۔ ص ۲۳۳

مرشد قلی خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص اسکو درست نہیں کر سکتا تھا۔ دکن میں ایک خرابی یہ تھی کہ یہاں مالگذاری کا کوئی نظم ہی نہ تھا۔ آراضی کی پیمائش تھی نہ لگان کا تعین حکومت کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس ولایت میں کتنی زمین زیر کاشت ہے اور کس قدر خشک اور بنجر اور جو زیر کاشت ہے ان کی زرخیزی کے مدارج کیا ہیں۔ اب لگان کس طرح وصول کیا جائے لگان اصل میں ہل کی تعداد سے لیا جاتا تھا۔ ہل کی تعداد سے زمین کی وسعت کا اندازہ ہوتا تھا کہ فلاں زمیندار کے پاس اس قدر زمین ہے اور اس سے اس قدر لگان وصول ہونا چاہیئے۔[1] یہ ایک بے ڈھنگا طریقۂ کار تھا جو قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اور حکومتیں آنکھ بند کر کے لگان وصول کر لیتی تھیں۔ ملک عنبر نے اپنے زمانے میں اس اندھیرے میں کچھ شمعیں روشن کی تھیں۔ ملک عنبر دکن کا بہت بڑا ناخدائے سیاست گذرا ہے جس نے سترھویں صدی کے اوائل میں نظام شاہیوں کی ڈگمگاتی ناؤ کو سہارا دیا تھا۔ اس کے بہتیرے تمدنی کارنامے ہیں۔ منجملہ ان کے آراضی کی پیمائش اور لگان کا تعین بھی ہے۔ لیکن یہ کام صرف مہاراشٹر تک محدود رہا اور یہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ۱۰۳۵ھ ۱۶۲۶ء میں ملک عنبر راہیِ عدم ہو گیا۔ اور اس کے جانشینوں میں وہ حوصلہ اور عزم کہاں تھا کہ اس کے ادھورے کام کو پورا کریں جو کام ہوا تھا اس پر بھی پانی پھر گیا اب یہ مغل سربراہوں کا فرض تھا کہ اپنے حسنِ تدبر سے اس گتھی کو سلجھاتے۔ مرشد قلی خاں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا اور اصلاح حال کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔

دکن میں مرشد قلی خاں کا کام اصل میں اصلاحات مالگذاری اور بند وبست ہے۔ انہوں نے جلد پانچ سال کے اندر دکن میں وہ کام کیا جو ٹوڈرمل نے عہد اکبری میں

---

[1] ماثر الامراء جلد سوم ص ۴۹۶ - منتخب اللباب جلد اول ص ۳۲۴

شمالی ہند میں کیا تھا۔ اسی وجہ سے مرشد قلی خاں کو دکن کا ٹوڈرمل کہتے ہیں۔ جب انہوں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا تو ان کے سامنے آراضی کی پیمائش زرخیزی کی تشخیص اور لگان کا تعین جیسے کٹھن مسائل تھے، سچ پوچھو تو مالی اصلاحات جو ٹوڈرمل نے شمال میں اور مرشد قلی خاں نے دکن میں انجام دیں ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کا زرین تمدنی سرمایہ ہے۔ تاریخ میں مہذب قومیں انہیں اصلاحات سے پہچانی جاتی ہیں کہ ان کا پایہ تہذیب کسقدر اونچا تھا۔ اگر یہ تہذیبی سرمایہ نہ ہو تو قوموں کی داستان خشک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اس میں جنگ و جدل کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ آراضی کا بندوبست نہ ہو تو حکومتیں بے بس ہو کر رہ جائیں گی اور ان کو خبر نہ ہوگی کہ ان کی علمداری میں کسقدر زمین مزروعہ ہے اور کس قدر غیر مزروعہ اور زرخیزی کا کیا حال ہے۔ بندوبست آراضی کا پہلا مرحلہ پیمائش ہے۔ یہ بڑا صبر آزما کام ہے کہ ہاتھ میں زنجیر لے کر میلوں اراضی ناپتے چلے جائیں۔ یہ بات اہل دکن کو معلوم ہے کہ مرشد قلی خاں نے اراضی کی پیمائش میں کس قدر جاں فشانی کی تھی۔ انہوں نے اس کام میں دوسروں پر اعتماد نہیں کیا۔ بلکہ خود اپنے ہاتھ میں زنجیر پکڑی اور سیکڑوں میل زمینات کی پیمائش کی۔ ان کو ڈر تھا کہ دوسرے لوگ اس کام میں کوتاہی کر جائیں اور بددیانتی سے کام خراب کریں[1]۔ جب یہ صبر آزما کام ختم ہوا تو بہ لحاظ زرخیزی اراضی کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا۔ اور اس کے بعد لگان کا تعین پیش نظر ہوا۔ اس خصوص میں بھی مرشد علی خاں نے پوری دیانت داری کی چنانچہ پورے احتیاط اور جانفشانی کے ساتھ زرخیزی کی جانچ پرتال کی۔ تمام آراضی کو بذات خود دیکھا اور پیداوار کا اندازہ لگایا۔ اس طریقہ سے بہ لحاظ زرخیزی

---

[1] - ماثرالامرا جلد سوم ص ۴۹۶ - منتخب اللباب خافی خاں جلد اول ص ۴۳۴

اور قوت پیداوار آراضی کی تین قسمیں قرار دی گئیں، یعنی اچھی، بُری اور اوسط۔
رہا لگان کا تعین تو وہ بھی کافی غور و خوض کا طالب تھا۔ وہ تین طریقہ سے عائد کیا گیا، ایک
ریبستہ جو قدیم زمانے سے رائج تھا اہمیں کاشتکار کو بلا لحاظ آبپاشی ایک معین رقم ادا
کرنی پڑتی تھی۔ دوسرے بٹائی اس کی پھر تین قسمیں تھیں۔ جو کاشت برسات کے پانی سے
ہوتی تھی تو اس میں پیداوار کا نصف سرکاری لگان قرار دیا گیا۔ اور جو کاشت کنوؤں کے
پانی سے ہوتی تھی تو وہاں ایک تہائی لگان مقرر ہوا۔ لیکن جس آراضی میں پھول، پھل اور
گنا وغیرہ ہوتا تھا وہاں زیادہ رعایت ملحوظ رکھی گئی۔ یعنی پیداوار کا صرف نواں حصہ لیا گیا
کیونکہ اس کاشت میں کاشتکار کو زیادہ عرق ریزی کرنی پڑتی ہے اور اس کا خرچ بھی زیادہ
ہوتا ہے۔ اور جو کاشت نہر سے اور تالاب کے پانی سے ہوتی تھی تو وہاں لگان ایک تہائی
اور جہاں پھل اور دال پیدا ہوتی تھی وہاں صرف ایک چوتھائی لگان مقرر ہوا۔ یہ ٹوڈرمل کا نظام
مالگذاری ہے جو ایک صدی پہلے شمال میں رائج کیا گیا تھا اور اب مرشد قلی خاں کے ہاتھوں
دکن کے چاروں صوبوں بھی رائج ہوگیا۔ مرشد قلی خاں نے جو لگان مقرر کیا تھا وہ برسوں
تک دکن میں دہارا مرشد قلی خاں کے نام سے موسوم تھا۔ اور آج بھی لوگ اسکو یاد رکھتے ہیں۔
خافی خاں کہتا ہے " مرشد قلی خاں دیوان دکن درآں ملک تا انقضائے روزگار از جملہ کارنامہائے
وزرا یادگار خواہد ماند[1]" شاہنواز خاں لکھتا ہے کہ " نامش بسبب ایں دستور العمل تا انقضائے
اعوام و شہور بسیار بر صفحۂ روزگار خواہد ماند[2]"۔

مرشد قلی خاں کا کام مالی اصلاحات پر ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ ہے انکی
اصلاحات کی تہ میں انسانی ہمدردی بھی چھپی ہوئی تھی۔ یہ صرف مدبر سیاست ہی نہ تھے بلکہ ایک
دردمند انسان بھی تھے۔ وہ رعایا برایا کے آرام و آسائش اور فلاح و بہبود کو اپنا فرض میں
سمجھتے رہے۔ شکستہ دلوں کا مداوا انکا وظیفۂ حیات تھا۔ دیہات کے کاشتکاروں کو جو (بقیہ صفحہ ۱۲۳ پر)

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۱۱ جلد اول ص ۳۴۷، [2] ماثر الامراء جلد دوم ص ۴۹۶۔

اورنگ زیب عالمگیر اور اُسکے معاصر مشائخ

از سید صلاح الدین عبدالرحمٰن شریک ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی

شاہ جہاں نے اپنے عہد میں دین اور مذہب کی ترویج کرکے اپنی حکومت میں اسلامی فضا قایم کرنے کی کوشش کی جس کے بیّن شواہد دہلی کی جامع مسجد، آگرہ کی موتی مسجد اور اس کی بنائی ہوئی دوسری مسجدیں بھی ہیں ظاہر ہے اس نے اپنے شہزادوں کو بھی پوری مذہبی تعلیم دلانے کی کوشش کی، داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مُراد سب ہی اپنے زمانہ کے جیّد علماء سے تعلیم پاتے رہے۔ ان میں اورنگ زیب نے معقولات و منقولات کی تعلیم میر محمد ہاشم گیلانی سے پائی[1]۔ کلام پاک کا درس ملّا موہن (ساکن بہار شریف) سے لیا[2]۔ امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم مولانا سید محمد قنوجی سے پڑھی[3]، کلام پاک کی تفسیر کا درس ملّا جیون سے لیتا رہا[4]، فقہی جزئیات کو شیخ عبدالقوی برہان پوری سے سمجھا[5]، ملّا شفیعائی دانشمند خاں سے بادشاہ بننے کے

---

[1] بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری۔ ج ۱ ص ۲۶-۲۵ [2] مآثر الکرام ص ۴۳

[3] تذکرۂ علمائے ہند۔ ص ۸۳۔

[4] مآثر الکرام۔ ص ۱۷-۳۱۶۔

[5] مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۶-۲۲۵

زمانہ میں بھی خاص خاص کتابیں پڑھتا رہا، اس کو دینی علوم سے فطری رغبت بھی تھی لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی میں ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ امام غزالی کی تصانیف، شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے مکتوبات اور شیخ محی الدین سبزواری کے رسائل اس کے مطالعہ میں برابر رہتے ۔ اس نے کلام پاک حفظ کیا تو قرآنی علوم سے بھی اس کی دلچسپی بڑھی، اپنی بادشاہت کے زمانہ میں جب اس نے فتاویٰ عالمگیری کا تدوین کا کام شروع کرایا، تو اس کو شیخ نظام برہان پوری، ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جونپوری، شیخ وجیہہ الدین گوپاموی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری سید نظام الدین ٹھٹھوی، ملا غلام محمد لاہوری وغیرہ جیسے علماء اور فقہا کی صحبت حاصل رہی۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی حامیِ دین اور پابندِ شریعت ہوتا گیا۔ اس لئے وہ شروع ہی سے ایسے مشائخ کا بھی قدرداں رہا، جو شریعت اور اسلامی شعائر کے پابند تھے۔

جب وہ دکن کا صوبہ دار تھا تو اس زمانہ میں حضرت عبداللطیف برہان پوری ایک مشہور بزرگ شریعت کے بڑے پابند تھے، نغمہ وسرود، غنا اور آلۂ غنا دونوں کو ناپسند کرتے تھے، شادی بیاہ کے موقع پر کوئی جلوس ان کی خانقاہ کے سامنے سے گاتا بجاتا گذر نہیں سکتا تھا۔ دوسرے بزرگ ان کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم کو شکر گذار ہونا چاہیئے کہ ایسے متشرع اور حق پرست بزرگ ہم میں موجود ہیں، اورنگ زیب ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایک بار اس نے ان کی خدمت میں عرض کیا، کہ اگر اجازت ہو، تو خانقاہ کے مصارف کے لئے کچھ گاؤں

لہ ماثر عالمگیری۔ ص ۳۸۰ اردو

پیش کئے جائیں، لیکن انہوں نے یہ شعر پڑھ کر گاؤں لینے سے انکار کیا۔

شاہ مارا دہ دہد منت نہد

رازقِ ما رزق بے منت دہد

اورنگ زیب اس شعر کو سن کر متاثر ہوا، لیکن اس نے عرض کیا، کہ ہم فقراء اور اہل اللہ کی خدمت خیر دنیوی اور برکت اخروی کے لئے کرتے ہیں، گاؤں پیش کرکے احسان کرنا مقصود نہیں، حضرت عبداللطیف نے فرمایا کہ اگر خیر و برکت حاصل کرنا ہے، تو رعایا سے صرف نصف غلہ لو بلکہ محنت کش اور مظلوموں کے پاس اور بھی زیادہ چھوڑو۔ گوشہ نشینوں متوکلوں کے لئے وظائف مقرر کرو مظلوموں کی دادرسی اس طرح کرو کہ ان کی حق تلفی نہ ہو، اور ظالموں کے ہاتھ کمزوروں کے لئے کوتاہ ہو جائیں وغیرہ، اورنگ زیب نے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا، اور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی جیساکہ اس نے اپنے ایک رقعہ میں ذکر کیا ہے۔[۱]

اورنگ زیب کو ان کے آخر وقت تک ان سے عقیدت رہی منتخب اللباب میں ہے۔

"خلد مکاں را در خدمت ایشاں ارادت و حسن عقیدت تمام بود، و ہیچ ماہ و ہفتہ نہ بود کہ فرمان تکلف آمیز بہ دستخط خاص بنام ایشاں صادر نشود۔" (جلد دوم ۵۵۶)

شیخ عبداللطیف برہان پوری کے ایک خاص مرید ملا قطب ہانسی ملتان کے رہنے والے تھے۔ اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ میں برہان پور میں اس سے ملے اورنگ زیب

---

[۱] رقعات عالمگیری شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر ۲۲ و مقدمہ رقعات عالمگیری ص ۱۳۲، منتخب اللباب از خافی خاں حصہ دوم ص ۵۶ - ۵۵۵

اسی وقت سے ان کا قدرداں ہو گیا۔ اور جب وہ بادشاہ ہو گیا تو اس نے ملا صاحب کی خدمت میں چار لاکھ درم پیش کئے، اور ایک گاؤں بھی اُن کے نام سے موسوم کیا جس کا نام قطب آباد رکھا گیا۔[1]

برہان پور میں ایک دوسرے بزرگ تھے جو مریدوں کی تربیت کرنے میں بہت سختی کرتے تھے، ان کی خانقاہ میں کچھ ایسے مرید بھی جمع ہو جاتے جو ان کی محبت اور عقیدت میں عالم سکر میں ان کو خدا کہہ دیتے۔ شیخ برہان اس کو پسند نہ کرتے اور جب وہ باز نہ آتے تو ان کو سزا کے طور پر قید کر دیتے، اور جو مرید شریعت کی خلاف ورزی کرتے اور ان کی نصیحت قبول نہ کرتے تو ان کو شہر کے قاضی کے حوالے کر دیتے جو ان کو قید کر دیتا اور پھر بھی وہ باز نہ آتے تو قاضی ان کو قتل کرا دیتا، اورنگ زیب جنگ جانشینی کے لئے دکن سے روانہ ہوا تو وہ حضرت شیخ برہان کی خدمت میں برہان پور حاضر ہوا۔ شیخ برہان ہندو مسلمان سے بے تکلف ملا کرتے ان کے لئے ان کی خانقاہ کا دروازہ کھلا رہتا۔ لیکن وہ بادشاہ اور امراء سے ملنا اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے اورنگ زیب بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا، اک نو وارد کو دیکھ کر شیخ برہان نے نام پوچھا۔ اورنگ زیب نے جب اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے، اور جب عام لوگوں کو تبرک دینے لگے تو اورنگ زیب کو کچھ نہ دیا۔ لیکن اورنگ زیب اس سے بد دل نہ ہوا۔ دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہونچا شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے تو لے لو، ہم کہیں اور چلے جائیں گے، اورنگ زیب اس سے بھی دلگیر نہ ہوا، تیسرے دن پھر وہ ان کے پاس گیا۔ شیخ برہان نماز کے لئے خانقاہ سے باہر نکل

---

[1] مرآۃ العالم قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۳۰۱۔

رہے تھے کہ وہ مودبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ اگر مجھ کو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کروں گا۔ آپ باطنی توجہ فرمائیں۔ یہ سُن کر شیخ برہان نے فوراً کہا کہ ہمارے جیسے کم اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے، تم بادشاہ ہونے کی، عدل پروری اور رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو ہم بھی دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اس سے کہا کہ بادشاہی مبارک ہو۔[۱]

اور جب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس کو اپنی شریعت نوازی کے سبب قدم قدم پر ابتلا و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ ان ہی میں دارا شکوہ اور حضرت سرمد کے قتل و شہادت کے بھی واقعات ہیں۔ یہاں پر حضرت سرمد کے ساتھ دارا شکوہ کا نام اس لئے لیا گیا ہے کہ وہ شیخ وقت ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کے مرشد ملّا جیوا اپنے مریدوں کو اسی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اور وہ ان سے کہتے تھے کہ تم اس کی طرف متوجہ نہ ہو گے تو خدا سے پھر جاؤ گے (حسنات العارفین از دارا شکوہ۔ ص ۴۲) اور وہ خود بھی اپنی تصنیف سکینۃ الاولیاءؒ میں لکھتا ہے کہ جہاں اور کوئی طالب سالہا سال کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے پہونچتا ہے میں بغیر ریاضت کے یکبارگی پہونچ گیا۔ اور جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا پھر (ص ۵) اس کی زبان سے کچھ ایسے کلمات نکلنے لگے جنکو سن کر علماء آزردہ خاطر ہوئے لیکن وہ خود اپنی مدافعت میں حسنات العارفین کی تمہید میں لکھتا ہے کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایسا مقام بھی

---

[۱] منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۵۵۵

آتا ہے جب ایک سالک شریعت و طریقت، کفر و ایمان، خیر و شر اور عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور بے خودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ قابل مواخذہ نہیں۔ (دیکھو تمہید حسنات العارفین از داراشکوہ) لیکن داراشکوہ کی اس تاویل سے علمائے ظاہر مطمئن نہیں تھے۔ پھر اس نے مجمع البحرین لکھ کر اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بنانے اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی اور یہ بھی بتایا کہ اسلامی تصوف اور ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں۔ توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہونچ سکتے ہیں علمائے ظواہر نے داراشکوہ کے ان خیالات کو مطلق پسند نہیں کیا۔ اور جب اس نے اپنشد کا مطالعہ کیا تو اس کی تمہید میں اس کا بیان ہے کہ اس کو علم توحید، توریت و انجیل اور زبور کے مطالعہ سے حاصل نہ ہو سکا۔ کیوں کہ ان میں توحید کا بیان مجمل ہے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی تسلی قرآن پاک سے بھی نہ ہو سکی کیوں کہ اس کی اکثر باتیں رمزی ہیں آخر اس کو توحید کی تمام باتیں اپنشد میں مل گئیں، جس کے پچاس ابواب کا ترجمہ اس نے سنسکرت سے فارسی میں کر کے عام کیا۔ وہ رفتہ رفتہ توحید وجودی کا قائل ہو کر، بھگوت گیتا، بشسٹ اور رام چندرجی کا بھی معترف ہو گیا اور دیر و حرم کی تفریق مٹانی چاہی۔ جو ظاہر ہے کہ اسلام کے راسخ العقیدہ علماء، فقہا اور صوفیہ کو پسند نہ آیا۔ عالمگیر نے جب دھرمات اور سموگڑھ کے محاذ پر داراشکوہ کی سیاسی قسمت کا فیصلہ کر دیا تو پھر اس کو شریعت کے محاذ پر لا کر اپنی راہ کے کانٹے کو دور کرنے میں کیا دیر لگ سکتی تھی خصوصاً جب راسخ العقیدہ علماء، فقہا اور صوفیہ دارا کو مرتد اور ملحد سمجھتے تھے، وہ ارکان دین اور شریعت کے فتوے سے تہ تیغ کیا گیا۔ آج کل کے مورخین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس کی رواداری اور وسیع المشربی سے متاثر ہے

اور یہ کہتا ہے کہ اگر دارا شکوہ تخت نشین ہوتا تو مسلمانوں کی حکومت برابر قایم رہتی۔ لیکن اورنگ زیب کے حامی یہ کہتے ہیں کہ دارا شکوہ کے تخت نشین ہونے سے مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی لیکن اسلام باقی نہ رہتا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی سے اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت تو کچھ دنوں کے بعد باقی نہیں رہی، لیکن اسلام باقی رہا۔

حضرت سرمد کا معاملہ دارا شکوہ سے کچھ مختلف تھا وہ بھی دارا شکوہ کی طرح ایسی ہی توحیدِ وجودی کے قائل تھے جس کو علماء اور شریعت نواز صوفیہ پسند نہ کرتے تھے اسی لئے وہ دارا شکوہ کے حامی تھے۔ اور انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ شاہ جہاں کے بعد وہی بادشاہ ہوگا۔ لیکن جب وہ پسپا ہو کر قتل کر دیا گیا تو عالمگیر نے سرمد سے دریافت کیا کہ انہوں نے دارا شکوہ کو بادشاہت کی جو خوش خبری دی تھی وہ کیسے پوری نہ ہو سکی سرمد نے جواب دیا کہ وہ مژدہ صحیح نکلا۔ کیونکہ دارا کو ابدی سلطنت کی خوشی نصیب ہوئی[۱] ظاہر ہے کہ یہ تاویل اورنگ زیب کو ناگوار گذری ہوگی۔ لیکن ان پر اور طرح طرح کے الزامات تھے۔ ان کی حسب ذیل رباعی کی شہرت ہوئی۔

آنکو کہ سرِ حقیقتش باور شد
خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بہ فلک
سرمد گوید فلک با حمد در شد

تو ان پر یہ الزام رکھا گیا کہ وہ معراجِ جسمانی کے منکر ہیں[۲]۔ وہ برہنہ رہا کرتے تھے۔ حکومت کے قاضی عبد القوی نے ان سے باز پرس کی تو انہوں نے جواب دیا کہ شیطان قوی است[۳]

---

[۱] تذکرۂ حسینی و ریاض الشعراء قلمی۔ [۲] مرأۃ الخیال ص ۲۱۶ [۳] ریاض العارفین ص ۱۴۰۔

اس کو قاضی عبد القوی اپنے اوپر طنز سمجھے اور انہوں نے ان پر عریانی کا جرم قایم کرکے عالمگیر کو ان کے قتل کا مشورہ دیا۔ لیکن عالمگیر نے اسے یہ کہہ کر رد کیا کہ صرف عریانی وجہ قتل نہیں ہوسکتی ہے۔ ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا صرف ایک جزو یعنی لا الٰہ پڑھتے ہیں اس امتحان کے لئے شاہی دربار میں علماء کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سرمد بھی طلب کیے گئے۔ ان سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے حسب عادت صرف ایک جزو یعنی لا الٰہ پڑھا۔ علماء نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں مرتبہ اثبات پر نہیں پہونچا ہوں تو پھر جھوٹ کیسے کہوں علماء نے کہا ایسا کہنا کفر ہے۔ اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر ہوگیا[1]۔ حضرت سرمد کی قبر اب بھی مرجع خواص وعوام ہے اور انہوں نے محبت الٰہی، دیدار الٰہی اور دیدار نبوی پر جو رباعیاں کہی ہیں وہ آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن ترک شریعت کی وجہ سے وہ قانون شریعت کی زد میں آگئے۔ قانون صرف دار وگیر کرتا ہے۔ رواداری یا پاسداری کو راہ نہیں دیتا کیونکہ اس سے ہر قسم کی پراگندگی اور انتشار پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

دارا شکوہ اور حضرت سرمد کے قتل وشہادت میں مورخین سیاسی مصالح بھی شامل کرتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں توحید وجودی کی جو دستکاریاں ہوئیں ان سے طرح طرح کے فتنے اُٹھتے گئے۔ جن کی آڑ میں شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کیا جانے لگا۔ شریعت کو حقیقت کا چھلکا بنایا گیا۔ انا الحق کا نعرہ بلند ہونے لگا۔ حسینوں کی صحبت سے وسائی حق کی راہ تلاش کی جانے لگی۔ سادہ رخوں میں اللہ ہی کا رنگ دیکھا جانے لگا۔ حسینوں کے غمزوں اور عشوؤں کے ذریعہ مجازی

---

[1] تذکرۂ حسینی، تذکرۂ مخزن الغرائب وریاض العارفین۔

عشق سے حقیقی عشق تک پہونچنے کا ذریعہ قرار دیا جانے لگا۔ راسخ العقیدہ صوفیہ ان تمام باتوں کو بدعت، گمراہی اور ضلالت قرار دیتے، وہ صرف اِلاَّ اللہ کہنے والے کو مسلمان سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے جب تک وہ محمدؐ رسول اللہ کے بھی قائل نہ ہوتے۔ وہ توحید اور رسالت دونوں پر یقینِ کامل رکھنے ہی میں عقیدہ اور ایمان کی سلامتی سمجھتے، اور کہتے کہ صوری اور معنوی اخلاق کی درستگی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نہ ہو۔ اس متابعت کے ذریعہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی قربت حاصل ہونا ممکن ہے۔ وہ انا الحق کہنے والوں کو مرتد اور بے دین سمجھتے۔ اسی لئے ان کے خلاف ہنگامہ کرتے اور سلاطینِ وقت سے مل کر اُنہیں قتل کرا دیتے۔

توحید کے اس قسم کے پرستاروں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو آواز اُٹھائی تھی وہ برابر گونجتی رہی۔ اور خود ان کے صاحبزادے حضرت خواجہ معصوم سرہندی اُن کے علوم و معارف کے بہت بڑے شارح تھے۔ بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کر کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی تجدید اور اصلاح میں لگے تھے۔ ان کی تعلیم تھی کہ سنّت کا اتباع اور بدعت سے اجتناب کرنا ہر حال میں دامن متابعت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھامنا اور آثار صحابہ پر چلنا ضروری ہے۔ اور اپنے تمام مریدوں اور متوسلوں کے نام کے خطوط میں اسی کی تربیت دیتے رہے۔ مثلاً ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"اے بھائی! ناجنس اور مخالف طریق کی صحبت سے بچتے رہنا اور بدعتی کی مجلس سے گریزاں رہنا۔ یحییٰ معاذ رازی قدس سرہ کا مقولہ ہے کہ ان تین اصناف سے اجتناب کرو۔

(۱) علمائے غافلین۔ (۲) قرائے مداہنین۔

(۳) متصوفہ جاہلین ۔ جو شخص مشیخت کی گدی پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کا عمل موافق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے اور نہ وہ خود زیور شریعت سے آراستہ ہے ۔ خبردار! خبردار! اس سے دور رہنا ۔ بلکہ احتیاطاً اس شہر میں بھی نہ رہنا ۔۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کامیابی کے تمام راستے بند ہیں، سوائے اس شخص کے راستے کے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانِ قدم کی پیروی کرے ۔۔۔۔ آداب نبوی کا خیال نہ رکھنے والوں اور سنن مصطفوی کے چھوڑنے والے کو ہرگز ہرگز عارف خیال نہ کرنا اس کے ظاہری تبتل، انقطاع، خوارقِ عادات، زہد و توکل اور زبانی معارف توحیدی پر فریفتہ و شیفتہ نہ ہو جانا ۔۔۔۔۔۔ مدارِ کار اتباع شریعت پر ہے اور معاملہ نجات پیروی نقش قدمِ رسولؐ سے مربوط ہے ۔ محق و مبطل میں امتیاز پیدا کرنے والی چیز اتباع پیغمبر ہی ہے ۔ زہد و توکل اور تبتل بغیر اتباع رسولؐ کے نامکمل ہیں ۔ اذکار و افکار، اشواق و اذواق بے توسل سرکار دو عالم غیر مفید ہیں ۔

۔۔۔۔۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا جس نے آداب سے سستی برتی وہ سنن سے محروم ہو گیا، جس نے سنن سے غفلت اختیار کی وہ فرائض سے محروم ہوا اور جس نے فرائض سے تہاون کیا وہ معرفت سے محروم

ہو گیا شیخ ابو سعید ابو الخیر سے لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے۔ انہوں نے فرمایا، ہاں گھاس کا تنکا بھی پانی پر چلتا ہے۔ پھر کہا گیا فلاں آدمی ہوا میں اُڑتا ہے، فرمایا چیل اور کوا بھی ہوا میں اڑتے ہیں، پھر کہا فلاں آدمی ایک لحظہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر چلا جاتا ہے، فرمایا شیطان تو ایک دم میں مشرق سے مغرب تک چلا جاتا ہے۔ ان باتوں کی کوئی قیمت نہیں۔ مرد حق دراصل وہ ہے جو مخلوق کے درمیان نشست و برخاست رکھے، بیوی بچے رکھتا ہو اور پھر ایک لحظہ خدا سے غافل نہ رہے، شیخ علی بن ابی بکر قدس سرہ نے معارج الہدایۃ میں فرمایا ہے کہ ہر انسان کا حسن و کمال تمام امور میں ظاہراً و باطناً و اصولاً و فروعاً، عقلاً و فعلاً عادۃً و عبادۃً کامل اتباع رسول میں مضمر ہے۔"

(مکتوبات خواجہ معصوم سرہندی" ص ۶۲ - ۶۳)

اورنگ زیب کا فطری اور ذہنی رجحان ان ہی تعلیمات کی طرف تھا اس لئے وہ حضرت خواجہ معصوم سرہندی رح کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا تیموری خاندان جہانگیر ہی کے زمانے سے حضرت مجدد الف ثانی رح کی تعلیمات سے متاثر تھا جہانگیر پہلے تو حضرت مجدد الف ثانی کا مخالف رہا۔ لیکن پھر ان سے اس کی عقیدت اتنی بڑھی کہ اپنے کو زیادہ تر ان ہی کی صحبت میں دیکھنا چاہتا تھا[1] اور شہزادہ خرم کو ان کے حلقۂ ارادت

---

[1] دیکھو مکتوبات امام ربانی دفتر سیوم نمبر ۴۳۰ -

میں داخل کر دیا تھا۔[1] عالمگیر نے خواجہ معصوم سے بیعت کر کے نہ صرف اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھا بلکہ ان سے تعلیم پا کر اپنی ایمانی اور روحانی بصیرت میں جلا بھی پائی اور حضرت خواجہ معصوم کو بھی تخت و تاج کے ایک مالک کی ذات میں وہ تمام باتیں ملتی گئیں جن سے ان کو دین و مذہب کے احکام کی اصلاحی تبلیغ میں ہر طرح کی مدد ملتی رہی اسی لئے وہ عالمگیر کی مذہبی اور روحانی تلقین و تربیت میں برابر مشغول رہے۔

ایک بار ایک مکتوب میں حضرت خواجہ معصوم نے عالمگیر کو یہ حدیث لکھ بھیجی کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت کب آئے گی۔ فرمایا تجھ پر افسوس تو نے قیامت کی تیاری کیا کی ہے (جو قیامت کو دریافت کر رہا ہے) اس نے عرض کیا میں نے تیاری تو کچھ نہیں کی ہے مگر اللہ اور اس کے رسول کو محبوب رکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا تو قیامت میں تو اس کے ساتھ ہو گا جس سے محبت کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے صحابۂ کرام کو اتنی مسرت ہوئی کہ میں نے اسلام کے علاوہ کسی چیز سے اتنی مسرت نہیں دیکھی۔ یہ حدیث لکھ کر جب خواجہ معصوم، عالمگیر کو تعلیم دے رہے تھے جو عالمگیر میں پہلے سے موجود تھی اسمیں اور جلا پیدا ہو گئی۔ حضرت خواجہ معصوم کا یہ خط عالمگیر کے کسی خط کے جواب میں تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے اپنی بعض روحانی کیفیات کا بھی اظہار کیا تھا۔ اور اس کا مداوا چاہا تھا۔ شاید عالمگیر پر گریۂ دل طاری رہتا تھا اس کے جواب میں حضرت خواجہ معصوم لکھتے ہیں۔

اس مکتوب سے راہ طریقت کا شوق ظاہر ہوتا ہے اسی لئے

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۶۱۳۔

مقصد کے حاصل ہونے کی اُمید ہے۔ ایک درویش نے
لکھا ہے کہ "اگر نخواستے داد نہ دادے خواست" یعنے اگر
اللہ تعالیٰ کچھ دینا نہ چاہتا تو طلب کا مادہ ہی پیدا نہ کرتا۔
صوفیہ کا یہ مقولہ ہے کہ جب قلب گم شدگی سے روتا ہے
تو روح یافت پر خوش ہوتی ہے۔ اس مقولہ کی رُو سے
گریۂ دل کو جو کہ از راہ طلب و شوق پیدا ہوا ہے یافت
روح پر دیں قرار دیا گیا ہے۔ یعنی گریۂ دل ہی سے روحانی
کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اور پھر اس کی وضاحت صوفیانہ اور عارفانہ انداز میں اسطرح کی ہے۔

الطائف خمسہ عالم امر آپس میں پڑوسیوں کا حکم رکھتے
ہیں۔ ان میں بعض لطائف ایک دوسرے سے زیادہ لطیف
ہیں، اور جو بھی لطیف تر ہے عالم غیب سے نزدیک
تر ہے۔ اور حضرت واہب سے فیوض حاصل کرنے میں
آگے بڑھا ہوا ہے۔ جب کبھی ان لطائف میں سے کسی لطیفہ
پر کوئی عطیہ وارد ہوتا ہے تو دوسرا لطیفہ جو اس قریب ہے
خبردار ہو جاتا ہے اور اس دولت پر رشک کرتا ہے اسکی
طلب میں کوشش کرتا ہے۔ اور اس کو گریۂ شوق دامنگیر
ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی لطیفہ پر وارد غیبی نمودار نہیں ہوتا
ہے تو تمام لطائف غافل رہتے ہیں اور راہ طلب بند
ہو جاتی ہے۔ پس گریۂ قلب دلیل ہے اس امر کی کہ روح کو
کچھ مل گیا۔ اس لئے کہ قلب و روح کو آپس میں نسبت

ہمسائگی اور اتصال حاصل ہے۔ ایک کی یافت سے دوسرا
واقف ہے۔ اس دولت کے زپانے سے نالاں اور اس کی
طلب میں دواں ہے۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معصوم نے اپنے ایک صاحبزادے
شیخ سیف الدین کو عالمگیر کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کے لئے اس کے
پاس بھیج دیا تھا۔ شیخ سیف الدین کو اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح کمالات صوری و
معنوی حاصل ہو گئے تھے۔ عالمگیر ان کو بہت محبوب اور مقرب رکھنے لگا تھا اور جب
اس نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال حضرت خواجہ معصوم کو لکھ بھیجا تو وہ مذکورہ بالا مکتوب
میں تحریر فرماتے ہیں۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ فقیرزادہ (شیخ سیف الدین)
منظور نظر قبول ہو گیا ہے اور اس کی صحبت موثر ثابت
ہوئی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو کہ فقیرزادے کا
شیوہ ہے اس پر آپ نے اظہار تشکر و رضامندی کیا ہے
اس اظہار تشکر پر شکر خداوندی بجا لایا اور اس سے میری
دعا گوئی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیا عجب نعمت ہے کہ اس
طمطراق بادشاہت اور دبدبۂ سلطنت کے ہوتے کلمۂ
حق سمع قبول میں آئے۔ اور ایک نامراد کا قول موثر
ثابت ہو۔"

اور آخر میں ایک کلام پاک کی آیت لکھ کر اپنے مکتوب کو ختم کرتے ہیں جس
کے یہ معنی ہیں کہ مژدہ دیجئے میرے ان بندوں کو جو بات کو سنتے ہیں اور نکو
ترین بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے

اور یہ لوگ صاحبان عقل وخرد ہیں۔ (مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مرتبہ مولانا نسیم احمد امروہوی۔ ص ۸۳ - ۲۸۱ -

ایک دوسرے مکتوب میں عالم گیر کو پہلے محبت الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل یعنی بے حقیقت اور فانی ہے پھر لکھتے ہیں کہ ایک باطل ہے جو حق نما ہے اور ایک عدم ہے جو وجود آسا ہے، ہر چیز کی ذات عدم ہے اور عدم ہر شر ونقص کا ماویٰ وملجا ہے۔ کسی چیز میں صفاتِ کمال کا پایا جانا مرتبہ وجوب سے مستعار ہے۔ پس خیر وکمال کا مرجع خداوند تعالیٰ کی ذات اقدس ہے جو واجب ہے۔ اور شر ونقص تمام تر ممکن کی طرف راجع ہیں، اسی لئے کلام پاک میں کہا گیا ہے کہ جو بھی بھلائی کسی کو پہونچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو بھی بُرائی کسی کو پہونچتی ہے وہ خود اس کی ذات سے ہوتی ہے۔ اور جو کوئی اپنی نادانی سے اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنے عارضی کمالات کو کامل خیال کرکے اپنے کو مبدء حسنات سمجھتا ہے وہ گویا مولائے حقیقی سے ہمسری کا دعویٰ کرتا ہے اور اس میں رعونت اور انانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جو کوئی اپنے صفاتِ کمال کو حق تعالیٰ کے کمالات کا پرتو سمجھتا ہے اور ان عارضی کمالات کو بالکلیہ اصل کے حوالے کرتا ہے اور اپنے آپ کو جو کہ آئینۂ کلام ربانی ہے محض خالی سمجھتا ہے اور معدوم محض دیکھتا ہے تب وہ فنائے حقیقی سے مشرف ہوتا ہے اور انانیت امارہ سے چھٹکارا پاتا ہے، پھر نفس امارہ تدریجاً نفسِ مطمئنہ بنتا ہے اسی وقت نعمتِ حق اس کے حق میں کامل ہوتی ہے۔

یہ گویا عالمگیر کو نصیحت تھی کہ کسی حال میں بھی وہ اپنے میں انانیت نہ پیدا ہونے دے۔ عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم سے بار گران بار جہانداری اور

اپنے حسن خاتمہ کے لئے بھی دعا کرنے کی درخواست کی تھی۔ جس پر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اس کے لئے پوری ہمت کے ساتھ برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کو یہ لکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ۔

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے آپ کو اس بارے میں خوف عنایت فرمایا ہے اس لئے بہت کچھ اُمیدیں ہیں یہ خوف کارہائے مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ کیوں کہ حدیث میں ہے خوفِ دنیا اور خوفِ آخرت کسی شخصِ واحد کے اندر جمع نہیں ہوتے۔ یعنی اگر کسی کے اندر خوفِ آخرت ہوگا تو خوفِ دنیا سے محفوظ رہے گا۔"

عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم کے صاجزادے شیخ سیف الدین کی پھر تعریف لکھی تھی اس پر حضرت خواجہ معصوم پھر تحریر کرتے ہیں۔

"فقیر زادے کی ادائیگی خدمات اور لوازم خیر خواہی آپ کی نظر میں پسندیدہ ہیں، یہ بات اس کے لئے موجب سعادت و باعث امتیاز ہوئی فقیر زادہ جو کہ صاحبِ کمالات صوری و معنوی ہے عزلت و عدم اختلاط کی عادت رکھتا تھا۔ چند آدمیوں میں بیٹھنے کی بھی اس کو عادت نہ تھی لیکن محض خیر خواہی نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ آپ کے پاس گیا ہے۔"

پھر اپنے صاجزادے کے توسل کو محض عنایات ربانی کا ایک سبب بتاتے ہیں اس لئے اورنگ زیب کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں۔

"مربیِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے وہ خود دردِ طلب دیتا

ہے اور اپنی طلب میں دوڑاتا ہے۔ خود راہِ وصل کھولتا ہے۔" ع

از ما و شما بہانہ بر ساختہ اند

اسی مکتوب میں عالمگیر کے خط کی تحریر کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے ایک عربی شعر بھی لکھتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ اس کے ہر لفظ میں آرزوؤں کا ایک باغ مضمر ہے۔ اور ہر ہر سطر میں موتیوں کا ایک ہار پنہاں ہے۔

ففی کُل لفظ منہ روض من المنی
وفی کُل سطر منہ عقد من الدرا

ایک اور مکتوب میں عالمگیر کے خط کے قلم کو عنبریں کہہ کر نوازا ہے۔ (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی۔ ص ۸۶۔ ۲۸۳۔ ۲۸۲۔)

حضرت خواجہؒ کے صاجزادے شیخ سیف الدین بھی عالمگیر کی باطنی کیفیات سے اپنے والد ماجد کو برابر مطلع کرتے رہتے ایک بار عالمگیر کے "اثرات ذکر در لطائف، قلتِ خطرات، قبول کلمہ حق، رفع بعض منکرات اور ظہور لوازم طلب کے متعلق لکھ بھیجا تو حضرت خواجہ نے شکر خدا ادا کیا کیونکہ اس قسم کی باتیں سلاطین میں نہیں پائی جاتیں۔ اور پھر یہ حدیث لکھی کہ جو سنت کو مردہ ہونے کی صورت میں کرتا ہے کرتا ہے اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔ یہ گویا اپنی طرف سے عالمگیر کو سو شہیدوں کے ثواب کی بشارت دے رہے تھے۔ اور آخر میں دعا کرتے ہوئے لکھتے ہیں (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی۔ ص۔ ۸۱۔ ۲۸۰)

بادشاہ کی ظاہری و باطنی صلاحیت کا خواستگار ہوں۔ ان کے باطن کو نسبت اکابر سے معمور پاتا ہوں۔

اور اُمیدوار ہوں کہ جلد ہی فنائے قلب کی دولت سے
مشرف ہو جائیں گے، یہ فنائے قلب درجاتِ ولایت
میں درجہ اولیٰ ہے۔ ع

بر کریماں کارہا دشوار نیست

شیخ سیف الدین نے ایک دیگر مکتوب میں اپنے والد ماجد کو عالمگیر کی نجی مجلسوں کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجالس سلطانی میں عجیب اسرار جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جوں ہی ان کی محفلوں میں داخلہ ہوتا ہے "عروج و نزول" کی کیفیات کے ساتھ ممتاز کر دیا جاتا ہے۔ اس کو پڑھ کر حضرت خواجہ معصوم نے تحریر فرمایا۔

"ٹھیک ہے اہل کمال ہر قطعۂ زمین پر وہ فیوض و اسرار جو ان کے مناسب حال ہیں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ہر زمین سے اس زمیں کے مناسب حال ہیں کو حاصل کرتے ہیں۔ کسی زمین کو معاملات فنا کے ساتھ مناسب ہوتی ہے اور کسی کو کمالات بقا کے ساتھ موافقت ہوتی ہے۔ کسی قطعہ کو عروج سے مناسبت ہے اور کسی کو نزول سے حرم مکہ کے کمالات و معاملات جدا ہیں حرم مدینہ کے فیوض و کاروبار جدا۔ ع

ہر خوش پسرے را حرکات دگرست

اسی مکتوب میں حضرت خواجہ لکھتے ہیں۔

تم نے بادشاہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا
تھا کہ ان کے اندر وسعت لطیفۂ اخفیٰ اور اس سے مناسبت

تامہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس بات کے مطالعہ سے خوشی ہوئی
لطیفۂ اخفیٰ سب سے بڑا لطیفہ ہے، اور اس کی ولایت
سب ولایات سے اونچی ہے۔ اس لطیفہ کے خاص سرورِ
کائنات کے ساتھ خصوصیت ہے۔ ہے۔ فقیر بھی بادشاہ
کے اندر لطیفۂ اخفا کی مناسبت پاتا ہے۔" الغیب
عند اللہ (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ج ۲
ص۔ ۸۹۔ ۲۸۸۔

ظاہر ہے کہ یہ خطوط بہت ہی نجی ہیں جن کو لکھتے وقت کبھی کاتب کو خیال نہ آیا ہوگا
کہ یہ طبع ہو کر عام لوگوں ہاتھ میں بھی پہونچیں گے اس لئے ان میں مصلحت یا ذاتی
منفعت کی جھلک نہیں پائی جاتی ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ
عالمگیر شریعت کی پابندی کر کے راہ سلوک کی بہت سی اعلیٰ منزلیں بھی طے کرنے
میں لگا ہوا تھا۔ اس لئے وہ اپنی بادشاہت کے زمانہ میں کسی ایسے صوفی کی طرف
مائل نہ ہوا۔ جو "احوال و مواجید" اور "کشوف و الہامات" کے قائل تھے۔ اور
بدعتوں میں مبتلا ہو کر ترک امر معروف کرتے اور سنت کے مطیع نہ ہوتے، بلکہ جو
صوفیہ کرام شریعت کے پابند ہوتے ان کی ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار رہتا۔ ان
کے پاس بے تکلف جاتا ان کی نصیحتیں سنتا بلکہ ان کی جھڑکیاں بھی برداشت کرتا۔

برہان پور کے ایک بزرگ شیخ نصیرالدین ہردی تھے وہ اپنی جوانی میں دونوں
پاؤں اور بائیں ہاتھ سے مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن ایک ہاتھ سے کلام اللہ اور تفسیر کی کتابت
کر کے روزی پیدا کیا کرتے تھے۔ کوئی نذر و نیاز پیش کرتا تو قبول نہ کرتے دولت مندوں
اور شاہی عہدہ داروں سے ملنا پسند نہ کرتے، برابر تلاوت کلام پاک میں لگے رہتے
تلاوت کرتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ عالمگیر کو ان کے توکل،

استغنار، صلاح، تقویٰ اور فضیلت کی خبر ملی تو برہان پور کے صدر کے ذریعہ سے
کوئی جاگیر دے کر ان کی مدد کرنی چاہی لیکن انہوں نے جاگیر لینے سے یہ کہہ
کر انکار کیا کہ میری طرح لاکھوں اور کروڑوں محتاجوں کو جو رزق دیتا ہے وہی
مجھ کو بھی رزق دے گا۔ منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۸

سورت کے ایک بزرگ سید سعد اللہ تھے جو شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے
تھے عقلی و نقلی علوم اور سلوک کی تعلیم پا کر مکۂ معظمہ چلے گئے۔ جہاں شریف مکہ نے
ان کو بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا۔ وہ شریف مکہ سے لوگوں کی سفارش برابر کرتے
رہتے۔ شریف مکہ نے ایک دو سفارش کو انکی نظر انداز کر دیا تو وہاں سے بد دل
ہو کر سورت چلے آئے۔ عالمگیر کو ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا تو اس نے
ان کی خانقاہ کے لئے ایک مکان اور ان کے اخراجات کے لئے دو گاؤں وقف کر دیے
ہندو و مسلمان دونوں ان کے یہاں آتے اور مستفیض ہو کر جاتے اور دونوں ان کو
پیشوا سمجھتے، وہ خلق اللہ کی نفع رسانی کے لئے ہر خاص و عام کی سفارش عالمگیر سے
کیا کرتے تھے۔ عالمگیر بھی ان کو دست خاص سے خط لکھا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے
ان کو لکھا کہ وہ درویشوں، عالموں اور دینداروں کے لئے سفارش کیا کریں
مگر انہوں نے بادشاہ کی بات نہ مانی، دوبارہ انہوں نے عالمگیر کو لکھ بھیجا کہ وہ ائمہ
اثنا عشری سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھتے عالمگیر نے بعض فضلا سے اس کے متعلق
استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، صحیح ہے۔ ایک بار
سید سعد اللہ نے ایک ہندو کو خط لکھا تو القاب کے بجائے یہ شعر لکھا۔

بنام آں کہ اُو نامے ندارد
بہر نامش کہ خوانی سر بر آرد

اس پر علماء نے اعتراض کیا، لیکن سید سعد اللہ نے یہ جواب دے کر ان کو

خاموش کیا کہ ہم ذات پاک واجب الوجود کے بغیر تمام ممکن الوجود کو معدوم جانتے ہیں۔

"ما بدونِ ذات پاک واجب الوجود ہمہ ممکن الوجود را معدوم الوجود می دانیم۔" (منتخب اللباب جلد دوم۔ ص ۵۶۱)

ایک دوسرے بزرگ میر مرتضیٰ ملتانی بھی تھے شریعت کی پابندی کا بہت لحاظ رکھتے جہاں مجلس سماع ہوتی وہاں نہ جاتے اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے سے منع کرتے جس محلہ میں رہتے وہاں سرود نغمہ کی آواز بلند کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی شاہی حاکموں کے یہاں کھانا نہ کھاتے اگر کوئی ان کے پاس آتا اور کہتا کہ مرید ہونے آیا ہوں تو وہ فرماتے یہ نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ توبہ و استغفار کرنے آیا ہوں اور آئندہ کوئی بات یا کام شرع کے خلاف نہ کروں گا۔ پھر طرح طرح کے سوال کرتے اور وہ جواب دیتا کہ ہر حال میں خدا کا حکم بجالاؤں گا تو پھر اپنے حلقۂ ارادت میں لیتے۔ اس طرح ملتان اور لاہور سے دکن تک ہزاروں مریدان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ کسی سے نذرانہ نہ لیتے جب تک کہ ان کو یقین نہ ہو جاتا کہ نذرانہ دینے والے کی کمائی حرام کی نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی کا نفقہ اور فرزندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔ نذرانہ لے کر اس کے ایک خمس سے تجارت کرتے، روزے برابر رکھتے، شب بیداری کرتے، تلاوت کلام میں مشغول رہتے، اور جب وعظ کہتے تو ظالم حکام، ریاکار علما اور حکام کے مصاحب فقراء کی بڑی مذمت کرتے۔ اور ایسے حکام کو برا کہتے جو خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرتے۔ سرود نغمہ سنتے اور بزرگوں کے مزار پر رقص و سماع کی محفل کراتے ایسے بدعتی عوام کے خلاف وعظ کہتے۔ جو شب برات، عاشورہ اور عیدین میں خلاف شرع باتیں کرتے رہتے، میت کے

نام پر کھانے پکوا کر تقسیم کرتے اور ان کے نام سے فاتحہ دیتے، تمباکو کو حرام بتا کر اس کے پینے کی سخت مخالفت کرتے۔ ان کی اس شدت پسندی سے حکام، علماء اور مشائخ کو بھی ان سے عداوت ہو گئی تھی۔ اورنگ آباد کے قاضی القضاۃ قاضی اکرم ان کے بڑے مخالف ہو گئے تھے۔ اور ایک بار انہوں نے ان سے مناظرہ کیا تو بڑی نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ عالمگیر پونا کے قلعہ کی تسخیر کے لئے وہاں پہونچا تو میر مرتضٰی اس سے ملنے گئے اور اس کو اپنی ایک کتاب دی جس کا نام حق گو تھا۔ عالمگیر نے اس کے دو تین ورق پڑھ کر کتاب کو زانو پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر کہا الحمدللہ ثم الحمدللہ ہمارے زمانے میں ایسے حق گو بھی ہیں اور پھر شہزادہ کام بخش کو کہا کہ سید صاحب کو اپنے گھر میں ٹھہراؤ۔ اور وہ جو کچھ فرمائیں اس کو سن کر عمل میں لاؤ۔ عالمگیر نے ان کے لئے کچھ ذریعہ معاش بھی مقرر کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا کچھ دنوں کے بعد عالمگیر نے ان سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک ایسا شہر دے دوں جو آپ کے احتساب کے مطابق ہو جائے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر خواص کے احتساب کے لئے مقرر کریں تو میں راضی ہوں، عوام تو میرے گرویدہ پہلے سے ہی ہیں۔ عالمگیر نے کہا کہ خاص و عام کے معنٰی نہ سمجھ سکا اس وقت قاضی اکرم بھی موجود تھے کہ سید صاحب کا مطلب بزرگوں کے مقبروں سے ہے۔ وہ اپنے مواعظ میں کہتے ہیں کہ جن بزرگوں کی قبروں پر طنبور، دہل اور دیگر ساز بجائے جاتے ہیں ان کی ہڈیوں کو اُکھاڑ کر جلا دینا چاہئے۔ عالمگیر نے یہ سُن کر کہا کہ میں اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میر مرتضٰی نے انکار کیا کہ وہ ایسا نہیں کہتے لیکن ان کی بات اس وقت تک نہ بنی اور گو عالمگیر ان کی عزت کرتا رہا۔ لیکن انہوں نے بادشاہ کے یہاں آنا جانا کم کر دیا۔ اور جب عالمگیر ان کو بلاتا تب ہی وہ اس کے پاس جاتے۔ پھر وہ علماء اور مشائخ کی مخالفت کے خیال سے

برہان پور منتقل ہو گئے۔ (منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۶۵ - ۵۶۱)

شاہجہاں آباد کے نزدیک ایک بزرگ شیخ بایزید تھے، جن کے ہندو مسلمان دونوں معتقد تھے وہ محتاجوں کی خبر گیری کرتے اور حکام سے ان کی سفارش کرنے میں مطلق دریغ نہ کرتے۔ ایک بار دہلی کی جامع مسجد میں وعظ کہنا شروع کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لڑکیوں کی شادی ضرور کی۔ پھر عالمگیر کو مخاطب کر کے کہا کہ اس کی لڑکیوں میں بعض نا کتخدا ہیں ہیں۔ عالمگیر نے ان کے وعظ کو بہت خاموشی سے سنا۔ (منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۰)

عالمگیری عہد میں ملا قطب الدین شہید سہالوی بھی بڑے برگزیدہ بزرگ تھے، عالمگیر نے ان سے کئی بار ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر ہر بار ملا صاحب نے اس سے ملنے سے انکار کیا۔ ان کی اس بے رخی سے وہ بھی دلگیر نہ ہوا۔ (فرحۃ الناظرین ص ۸۰)

شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اپنے علم و فضل، عبادت، ریاضت، زہد، تقوی اور تورع کے لحاظ سے مایۂ ناز علماء میں سے گذرے ہیں ان ہی کے خاندان سے علمی و روحانی فیوض و برکات کا وہ سرچشمہ پھوٹا ہے جس سے آج تک ہندو پاکستان کے ارباب علم اور اصحاب دل سیراب ہو رہے ہیں۔ عالمگیر نے فتاوائے عالمگیری کی تدوین شروع کرائی تو ان سے بھی معاونت چاہی، وہ شاہی دربار سے کسی قسم کی وابستگی پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اپنی والدہ کے اصرار پر فتاوی عالمگیری کی ترتیب میں شریک ہو گئے۔ لیکن شاہ صاحب کے مرشد حضرت خلیفہ ابوالقاسم نے دربار سے یہ تعلق پسند نہ کیا۔ اس لئے وہ جلد ہی اس کام سے علیحدہ ہو گئے۔ عالمگیر نے کچھ جاگیر دینی چاہی لیکن اس کو قبول کرنے سے انکار کیا عالمگیر ان سے ملنے کا برابر مشتاق رہتا مگر وہ بادشاہوں امیروں کے گھر جانا، اپنے

روحانی بزرگوں کے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک بار عالمگیر نے شاہ صاحب کے پاس شوقِ ملاقات کا پیغام بھیجا مگر وہ دربار میں جانے پر مطلق راضی نہ ہوئے۔ بلکہ ایک معمولی کاغذ پر جس میں ان کے جوتے لپٹے رکھے ہوئے تھے، یہ عبارت اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی حکومت کے شہنشاہ کے پاس بھیجدی۔

"اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت بڑا ہے، جو امیر کے آستانہ پر ہو۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا مَتَاعُ الدُّنیَا اِلَّا قَلِیلٌ۔ یعنی دُنیوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے۔ تم کو قلیل ترین جزو ملا ہے۔ اگر بالفرض مجھے دو گے تو وہ جزو لاتجزی ہوگا۔ اس ٹکڑے کے لئے جو پھر ٹکڑا نہ ہو سکے گا میں اپنے نام کو خدا تعالیٰ کے دفتر میں سے کیوں نکلواؤں، چشت کے بعض ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے"۔ (انفاس العارفین۔ از شاہ ولی اللہ ص ۶۹)

شاہ ولی اللہ اس خط کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ عالمگیر کو جب یہ رقعہ ملا تو اس نے رقعہ کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا۔

اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ عالمگیر ایک راسخ العقیدہ مسلمان بننے کی کوشش کرتا رہا۔ اور راہ طریقت پر چلنے کے باوجود وہ شریعت کا بڑا پابند تھا۔ آج کل کے غیر مسلم مورخین ایک حکمراں کی حیثیت سے اس کا مطالعہ کرتے تو اس کی شریعت نوازی پر تنقید و تنقیص دونوں کرتے ہیں، کیوں؟ اس کا جواب اس مقالہ کے

موضوع کے دائرے سے باہر ہے۔ لیکن کوئی مسلمان اس کے خلاف برُے الفاظ سننا پسند نہیں کرتا محض اس لئے کہ اس نے اپنے زمانے کے مسلمانوں میں مذہب کی ایک نئی روح پیدا کرنا چاہی۔ لیکن کیا یہ مستقل طور پر بیدار ہو سکی ؟ اگر نہ ہو سکی تو اس کا ذمہ دار کون ہے سلاطین یا علما یا مشائخ ؟ جس طرح عالمگیر کے جانشینوں پر الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر کی اس سلطنت کو سنبھال نہ سکے جس کو اس نے غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک پھیلا دیا تھا۔ اسی طرح علماء اور مشائخ پر بھی یہ الزام آتا ہے کہ عالمگیری عہد میں مسلمانوں میں جو نئی روح روح بیدار ہوگئی تھی اس سے نئی کے وارث بن کر وہ پوری بیدار مغزی سے فائدہ اٹھاتے اور مسلمانوں کی مذہبی، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو ہر طرح سنوارتے رہتے تو اس وقت مسلمانوں کی سیاسی زندگی بھی کچھ اور ہوتی۔ انہوں نے درس تدریس کی مسند اور محراب و منبر کی زینت ہی بننے پر اکتفا کیا۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں وہ کام انجام نہ دے سکے جن کی ان سے توقع تھی یا جو بگڑی ہوئی معاشرت اور سیاست یا بدلتی ہوئی صورت حال میں ان کو اپنے مذہبی فکر و عمل، ایمانی جوش و طاقت اور روحانی تدبر و بصیرت سے کرنا چاہئے تھا۔

عالمِ اسلام میں فتاوٰئے عالمگیری کی خدمات

از پروفیسر انوار احمد قادری ایس۔ایم کالج کراچی

تاریخ شاہد ہے کہ شہنشاہ عالمگیر نہ صرف ایک شہنشاہ تھے بلکہ وہ ایک فقیہہ بھی تھے۔ اور علوم دینیہ اور انصاف پسندی کے سمندر تھے۔ اور علم کے دلدادہ اور حامل علم کی جماعت کے معین اور مددگار تھے۔ اسلامی وقاران کے عہد زریں میں اپنی طاقت کے بلند ترین سطح پر فائق تھا۔ اور رتبۂ فلسفہ علوم شریعتِ اسلامیہ قرون اولی کے دور کے بعد اپنے اعلی سے اعلی تحقیق کے مرکز پر تھے۔ چونکہ عہد عالمگیر سے قبل شرعی مقدمات کے فیصلے کے لئے کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب فقہ کی موجود نہ تھی جسمیں تمام مسائل جمع کئے گئے ہوں اور جن سے ہر شخص با آسانی مسائل کا استخراج کر سکے۔ شہنشاہ عالمگیر نے اس خلاء کو محسوس کیا اور چنانچہ انہوں نے تمام علما اور فضلا کو جمع کر کے تصنیف کا ایک قانونی کمیشن قائم کیا۔ جس کے انچارج شیخ نظام برہان پوری تھے۔ اور انکی ماتحتی میں چار افسران اور بھی تھے۔ جن کی افرادی امداد کے لئے دس دس متفرق علما اور بھی تھے۔ اس کمیشن کے ممبر حضرت شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم بھی تھے۔ اس کام کے لئے شاہی کتب خانہ جس میں بے شمار کتابیں فراہم تھیں۔ وقف کر دی گئیں۔ سات آٹھ برس مسلسل محنت کے بعد وہ کتاب تیار کی گئی جو آج فتاوٰئے عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔ اس جامع کتاب میں جہاں نماز، حج، زکوٰۃ، ایمان، طہارت، نکاح، طلاق، جہاد، بیع کے مسائل ہیں وہاں

حدود تعزیر، قضا و پنچایت و آداب القاضی وغیرہ کے طریقے بھی درج ہیں جو شرع حنفیہ کی رو سے جائز تھے۔ اور جن کو سامنے رکھ کر قاضی فیصلے دیا کرتے تھے۔ اگر ان آداب کا ہم محققانہ مطالعہ کریں اور ان کا موازنہ قوانین و ضوابط دیوانی و فوجداری و شہادت وغیرہ سے کریں تو بہت حد تک ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ علاوہ قانون انگریزی کے الحاق کے ہند و پاکستان میں بہت سی باتیں فتاوٰئے عالمگیری سے ماخوذ کی گئی ہیں اور جو ہم میں رائج ہیں۔

اس موقع پر اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہو گا کہ فتاوٰے عالمگیری کا تعلق قوانین شرعیہ سے وہی ہے جو رومن شہنشاہ جیٹینئن کے قوانین کا تعلق گزشتہ قوانین روما اور موجودہ قوانین یورپ و انگلستان و امریکہ سے ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جیٹینین نے ایک کمیشن دس علماء کا مقرر کر کے ایک کوڈ مرتب کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ایسی جامع کوڈ مرتب کی جائے جس میں عہد گزشتہ کے قوانین کی چاشنی ہو۔ کوڈ مذکور ۵۲۹ء میں تیار کی گئی۔ مگر چونکہ وہ مکمل طور سے گزشتہ وکلا و فضلا کے خیالات نہیں دے سکی لہٰذا شہنشاہ نے دوسری ڈائجسٹ ۵۳۳ء میں تیار کروائی۔ جو اُنتالیس ۳۹ فضلا کے خیالات کا خلاصہ تھی لیکن یہ بڑی طویل تھی اور حیثیت برائے طلباء تعلیمی نہ رکھتی تھی۔ اس لئے دوبارہ کام شروع کیا گیا۔ اور ایک کتاب انسیٹوٹ کے نام سے مرتب کی گئی مگر پھر یہ بھی مکمل جوابات زمانۂ گزشتہ کے مسائل کا نہ دے سکی تھی لہٰذا حکم ہوا کہ ۵۰۱ نظروں کے ذریعہ اس کتاب کو دُھرایا جائے اور جو دوسری کوڈ بارہ کتابوں میں منقسم تھی تیار کی گئی اور جو موجودہ دور میں موجود ہے۔ اس سے بھی شہنشاہ نے بعد میں اپنے ذاتی اثرات میں رکھ کر تبدیل کیا بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ رومن قانون کی یہ کتاب صرف مسائل قوانین دنیاوی ہی رکھتی ہے۔ جس میں ذاتیات کا کافی دخل ہونے سے بڑی حد تک توڑ مروڑ پیدا کی

گئی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں اس رومن مجموعہ قانونوں میں اصول قانون وقانون شہریت، اصول قانون اخلاقیات میں فرق بالکل نہیں بتایا گیا۔ اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ زندگی کے فلسفے اور اطوار فلسفیانہ سے بالکل معریٰ تھا۔ اب اس جگہ اگر ہم شہنشاہ عالمگیر کے فتاوے عالمگیری پر نظر ڈالیں تو ہم اس کو رومن مجموعہ سے کہیں بلند و بالا پائیں گے۔ فتاوے مذکور چونکہ شریعت اسلامیہ کے بلند و عمیق اصول فقہ علم الفرد پر مبنی تھا لہٰذا وہ رومن مجموعات سے کہیں فصیح اور پراز دلائل ہے۔ یہ دنیاوی و دینوی تمام مسائل کے غور و خوض کے بعد نہایت محققانہ طریق پر مکمل کیا گیا تھا۔ لہٰذا رومن مجموعہ کی صرف بارہ کتب کے بجائے ۹۶ کتب میں مرتب کیا گیا تھا۔ جو کئی ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا۔ اس فتاوے پر اگر گہری نظر کی جائے تو ہم کو پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک طرف دنیاوی اصولی باتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ تو دوسری طرف زندگی کے عمل پر اس کا اثر ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اس کو ایک ایسی زنجیر کہہ سکتے ہیں جسے شریعت اسلامیہ کو مزید واضح ترقی پذیر ہونے کا موقع فراہم ہوا۔ موجودہ قوانین انگلستان و امریکہ سارے ملک ہی پاکستان میں اگر عدالت عالیہ کسی مقدمہ کا فیصلہ دیتی ہے تو یہ فیصلہ اس کی نوعیت کے دیگر مقدمات کے لئے نظیر بن جاتا ہے۔ اور یہ نظیر انہیں اقسام یا امور کے مقدمات میں رولنگ کا کام کرتا ہے۔ جسے بائنڈنگ پریسیڈنٹ کہتے ہیں۔ اور جو موجودہ قوانین کا ایک ماخذ سمجھا جاتا ہے شریعت اسلامیہ میں یہ کام دوسرے ڈھنگ سے فتاوے شریعت سے نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ یہ ایک قانونی طریقۂ عمل ہے۔ جو ایک فقیہہ یا مفتی سوالات مسائل شریعت کے جوابات میں لیتا ہے۔ اور جن کے ذریعہ عدالتیں مقدمات فیصل کرتی ہیں اور مسلمان اپنی زندگیوں میں عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس روشنی میں اگر فتاوے عالمگیری کو دیکھیں تو ہم کو اس کی خدمات کا عظیم اندازہ ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس فتاوے میں کسی اہم مسئلہ شرعیہ پر

نظر ڈالی ہے تو یہ امر عدالت کے لئے نظیر کا کام دیتا ہے اور عدالت مذکور اس سے بہتر جگہ کی متلاشی نہیں ہوتی اور اس پر مقدمہ کا فیصلہ کرتی ہے اس کی مثال تمام عالم اسلامی میں موجود ہے۔ جہاں فتاوے عالمگیری نظیر کا کام دیتی ہے۔ یہ نہ صرف مسائل دینی بلکہ عدالتی فیصلوں میں استعمال میں آتی ہے۔ ہمیں اس کی مثال عثمانیہ حکومت کا مجموعہ موسومہ بہ مجلہ میں ملتی ہے جہاں عدالتی کارروائیوں میں فتاوے عالمگیری استعمال ہوتا رہا ہے اور یہ متعدد بار قاہرہ اور دیگر عرب شہروں یا ممالک میں فتاوے ہندیہ کے نام سے مشہور ہے اور متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ یہ مراکش، انڈونیشیا، ترکی، قبرص سے لے کر جنوبی افریقہ کے تمام ممالک میں بطور ایک مدلل اور مستحکم تصنیف قوانین وفقہ اسلامیہ کے رائج ہے اور تمام مسلمان اس سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ اور عدالتیں اسے استعمال میں لاتی ہیں۔ دنیا کی تمام زبانیں مثلاً فرانسیسی، انگریزی، جرمنی، عربی فارسی وغیرہ جن میں قوانین اسلامیہ کی کتابیں لکھی گئی ہیں قریب قریب سب میں فتاویٰ مذکور کا حوالہ ملتا ہے۔

عہد مغلیہ میں عدالتی انصاف دیوانی یا فوجداری کی تمام کارروائیاں فتاویٰ مذکور کے لحاظ سے ہوتی تھیں اور امور سلطنت میں یہ کتاب بعنوان کتاب اسیر استعمال میں لائی جاتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فتاویٰ مذکور کے کتب عقوبات حدود وتعزیزات کا استعمال کیا۔ آداب الفاظی ضابطہ فوجداری میں لایا گیا جس کی مثالیں اٹھارھویں وانیسویں صدی کے مقدمات نظامت عدالت وصدر دیوانی عدالت کی رپورٹوں میں موجود ہیں علاوہ اس کے فتاویٰ مذکور ہندو پاکستان کے ہزاروں فیصل شدہ مقدمات میں برابر مستعمل رہا ہے۔ اور ہے۔ ان ممالک کے علاوہ دیگر ممالک مثلاً ملایا، سنگاپور، برما، افریقی ممالک اور عرب ممالک میں یہ عدالتوں میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کی ایک مثال بطور ثبوت کافی ہے اور وہ ۱۹۳۰ء

کے فلسطین سپریم کورٹ کا مقدمہ بعنوان صعدات کمال بنام اٹارنی جنرل فلسطین جو اپیل کیس سال مذکور صفحات ۵۰۲، ۵۲۳ میں درج ہے۔ سے ملتی ہے۔ مقدمہ مذکور میں ایک وقف کا نکتہ درپیش تھا لہذا فاضل ججوں نے ترکی مجلہ کے آرٹیکل ۱۶۶۰ لغایت ۱۶۶۷، و دیگر کتب و مقدمات فلسطین و قبرص کا حوالہ دیتے ہوئے فتاویٰ عالمگیری کی جلد دوم صفحہ ۲۷۴ کے ماخذ کو بطور نمونہ استعمال کیا اور اسے بہترین تحقیقی قوانین اسلامیہ بتلا کر فیصلہ اسی بنیاد پر کر دیا۔

دورِ حاضرہ میں بوجہ سیاسیات، خود غرضی، قوم پرستی اور موقع شناسی قوانین روما کا مختلف طریقہ پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ان فروعات حصوں کے جہاں یورپ کی حاکمیت مشرق میں سیاسی طور پر داخل ہوگئی ہے ہم دیکھتے ہیں بمقابلہ مختلف رنگینیت قوانین روما کے، شریعت اسلامیہ بوجہ ملت اسلامیہ و بذریعہ فتاویٰ عالمگیری زیادہ مستحکم ہے اور تمام مسلم ممالک و غیر مسلم ممالک، جہاں شریعت اسلامیہ عمل میں لائی جاتی ہے فتاویٰ مذکور کی تشریح بغیر روک ٹوک عمل میں لائی جاتی ہے۔ اور عدالتوں میں استعمال پذیر ہے۔ حالانکہ فتاویٰ مذکور ایک شہنشاہِ وقت نے مرتب کروایا ہے۔ پھر بھی چونکہ یہ ٹھوس مسائل شرعیہ کی تحقیقات پر مبنی ہے تمام عالم اسلام نے اسے زیادہ ترجیح دی اس کی مثال تاریخ قوانین عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ فتاویٰ مذکور کو ان تمام تحقیقی فقہی کتب جو ذاتی اور پرائیویٹ طور پر لکھی گئیں، کہیں زیادہ فوقیت حاصل ہے۔ میں اس کے ثبوت میں ۱۹۱۷ء کے مقدمے، موسومہ سماۃ تاج بی بنام مولا خاں جو بمبئی ہائی کورٹ کے فاضل جج مسٹر بمن نے دیا تھا پیش کرتا ہوں اس فیصلہ میں فاضل جج مذکور نے یہاں کہا کہ عالمگیریہ کو بمقابلہ درالمختار کے کہیں زیادہ فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہ مجموعہ ایک اسلامی حکومت کے شہنشاہ نے اپنے زمانے کے ماہرین علوم اسلامیہ کے

حالات و ضروریات کا کس حد تک ساتھ دے سکتے ہیں، اور قوانین پاکستان کو اسلامی نظریات پر لانے کا سوال بڑا اہم ہے۔ میری ناچیز رائے میں اگر آپ ہندوستان کے قانونی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ انگریزی حکومت نے رائج الوقت مغلیہ طریقۂ انصاف کو جو شریعت اسلامیہ پر مبنی تھا ختم کر دیا۔ انہوں نے قوانینِ اسلام جو عدالتی کارروائیوں ضابطوں وغیرہ میں استعمال ہوتے تھے بالکل نکال دیا۔ اور بقیہ ذاتی و خاندانی قوانین اسلام جو لاگو رکھے گئے ان میں بھی اپنا رنگ پیوست کر دیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قوانین اسلام کے دوسرے ضروری جزو الگ کرکے ایک کو قایم رکھا جائے تو کیا پریشانی نہ ہوگی۔ کیا یہ اشد ضروری نہیں کہ دونوں قایم رکھے جائیں۔ کیوں کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے اور بڑی حد تک درست بھی ہے کہ موجودہ دور میں قوانینِ اسلام کا اطلاق مکمل نہیں معلوم ہوتا۔ اوران کی غلط نکتہ چینی کی جاتی ہے اس کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ طریقۂ انصاف کے لئے ماڈل یا نمونہ کی اسلامک کوڈس ڈرافٹ کی جائیں۔ اور عدالتیں ان مختلف کوڈس کو اپنے سامنے رکھ کر فیصلہ دیتے وقت ان سے امداد لیں ان کوڈس کو بنانے میں فتاوے عالمگیری سے بڑی حد تک امداد لی جاسکتی ہے۔ دیگر اسلامی مذہبوں کے لئے ان کوڈس میں ان کی کتب سے اخذ کی ہوئی باتیں جو حنفیہ سے اختلاف کرتی ہوں شامل کی جائیں۔ اگر یہ کام چند سال میں عمل میں لایا گیا تو بفضل خدا تعالیٰ قوانین پاکستان کا اسلامی نظریات پر لانے کا مسئلہ بڑی حد تک آسان ہو جائے گا اور یہ بات تمام عالم اسلام و دیگر ممالک کے لئے نمونہ ثابت ہوگی۔

نذ

ذریعے مرتب کروایا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ جج موصوف نے فیصلہ مذکور میں اسلام کی فقہی کتب مثلاً فتاویٰ قاضی خاں ہدایہ وغیرہ پر بڑی عالمانہ طور پر بحث کی اور یہ کہا کہ تاریخ شاہد ہے کہ فتاویٰ عالمگیری نے نکتہ قانونی پر جو رائے ظاہر کی اسب سے بہتر ہے۔

فتاویٰ مذکور عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ ہوئے اور اردو زبان میں متعدد بار شائع ہوئے ہیں۔ انگریز مصنف مسٹر بیلی نے سب سے پہلے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لیکن یہ بات قابل صد افسوس ہے ان کے ترجمے میں غلطیاں ہیں جن میں ایک فاش غلطی مساۃ اسلو کے مقدمہ میں دریافت ہوئی تھی اگر بیلی صاحب کچھ توجہ فرماکر ہر مسئلہ میں ان کتب فقہ کا حوالہ لکھ دیتے جیسے انہوں نے مضامین یا عبارت کے ترجمے کئے ہیں۔ جیسا انہوں نے بعض مسائل میں کیا ہے کہ اسناد نقل کر دیے ہیں تو ان کی کتاب بہت زیادہ فائدہ مند ہوتی۔ ان غلطیوں کا دوسروں پر بھی اثر پڑا چنانچہ مسٹر امیر علی کی کتاب بھی ان غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔ جس کا سب سے عمدہ ثبوت عدالتی فیصلوں میں ملتا ہے۔ جو ان کتابوں ترجمہ دئے گئے ہیں مثال کے طور پر کلکتہ ہائی کورٹ کے ۱۹۰۳ء کے فیصلے موسومہ فاطمہ بی بی بنام احمد بخش ہی کو لے لیجئے۔ فاضل ججوں نے مسٹر بیلی اور امیر علی صاحب کی کتابوں کو فتاوے عالمگیری کا صحیح ترجمہ مانتے ہوئے فیصلہ دیا۔ اگر آپ فتاویٰ مذکور کے عربی زبان کی تالیف کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ حوالہ ان دو کتب کا غلط طور پر دیا گیا۔ جو وہاں نہ تھا۔ اپیل میں ہائی کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھا گیا۔

ان چند سطور کے بعد میں اپنا مقالہ ختم کرتا ہوں۔ لیکن چند ذاتی مشورے بھی ظاہر کرنا چاہتا ہوں آج کل یہ بات کہ دور حاضرہ میں قوانین اسلام کے جدید

عقیدت مندی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ مختصراً اس کی زندگی میں خلفائے راشدین کی زندگیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے دربار بلکہ پوری سلطنت کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی لیکن اس کا سب سے بہتر مظاہرہ ہم کو خود اس کی اپنی زندگی میں نظر آتا ہے۔

اس کے سیاسی فلسفہ کا بنیادی تصور یہ تھا کہ انسان کی نجات اور دنیا کے مسائل کا بہترین حل ہم کو اسلام ہی کے اصولوں میں مل سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم کو اس کی زندگی میں اور اس کی پالیسیوں میں یہ عقیدہ صاف طور پر نظر آتا ہے، حقیقتہً اس پر اعتراضات اور اختلافات کی بنیاد بھی یہ ہی عقیدہ ہے۔

ہم اس مقالہ میں اس کی چند اصلاحات کا مختصراً ذکر کریں گے تخت نشینی (جون ۱۶۵۹ء) کے کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے اس رواج کو بند کیا کہ شاہی سکوں پر کلمۂ طیبہ کندہ کیا جائے، اس کا خیال تھا کہ اس کلمہ کی توہین ہوتی ہے۔ سکے تجارت کی سہولت کے لئے ہیں۔ (مآثر امراء خافی خاں)

مغلیہ دربار میں ایک مدت سے جشن نوروز منایا جاتا تھا۔ اس کو بھی ختم کیا گیا کیوں کہ یہ ایک ایرانی رسم تھی اس کے بجائے اس نے رمضان کے آخری ایام اور عید الفطر کے موقع پر جشن منانا شروع کیا اور اس کو جشن نوروز کی جگہ جشن نشاط افروز کہا گیا عید الاضحیٰ بھی شان کے ساتھ منائی جاتی تھی اور شہنشاہ عام مسلمانوں کی طرح خود بھی قربانی کرتا تھا۔ (مآثر الامراء)

۱۶۶۸ء میں اس نے ایک حکم جاری کیا کہ ناچ گانے کی محفلیں سر بازار نہ کی جائیں، اور دربار کے گویّوں کو بھی منع کر دیا گیا۔ انہوں نے اس کے خلاف

انگریزی سے آزاد ترجمہ

عالمگیر کی معاشری اصلاحات

(از بیگم صلاح الدین لکچرار تاریخ کراچی یونیورسٹی)

شہنشاہ عالمگیر، برصغیر ہند پاکستان کے مشہور ترین حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی شہرت کا سبب یہی نہ تھا کہ وہ عظیم شاہانِ مغلیہ میں سب سے آخری بادشاہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں یہ سلطنت اپنے انتہائی عروج پر پہونچی، اس کی پالیسیوں کے متعلق مورخوں میں اختلاف رہا ہے اور شاید یہ اختلاف ہمیشہ رہے گا۔ لیکن اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اس کی اپنی زندگی اور اس کے اعمال اسلامی تعلیمات کے مطابق تھے۔

اس کی سادہ مزاجی پاکیزہ اخلاق اور درویشانہ مذاق، اکبر کی شان و شوکت، جہانگیر کی عیاشی اور آرام طلبی اور شاہجہاں کے ذوقِ تعمیرات سے بالکل مختلف بلکہ متضاد نظر آتے ہیں۔

تفریح اور دلبستگی کے ان تمام ذرائع کے باوجود جو مغل شہنشاہ کو حاصل تھے عالمگیر کا ایک سپاہی اور درویش کی طرح زندگی بسر کرنا انسانی

عملی زندگی کے منافی تھے۔

عالمگیر کی بعض اصلاحات سہل العمل تھیں، لیکن بعض اقدامات ایسے تھے جن پر پورے طور سے عمل نہ کیا جاسکا۔ مثال کے طور پر ہم اس کے اس حکم کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں جس میں کہا گیا تھا کہ ساری سلطنت میں بھنگ کی کاشت بند کر دی جائے۔ اس حکم میں بہت سختی کی گئی۔ یہاں تک کہ پرتگیزوں کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ شراب پی سکتے ہیں مگر شہر کے باہر جاکر۔ بعض مغربی سیاحوں نے لکھا ہے کہ بہت سے لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

معاشرتی اور سماجی اصلاحات میں بعض اور احکام کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے ستی کی رسم جس میں مظلوم اور بیوہ عورتوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ بند کر دی گئی۔ ہندوؤں نے اس پر شور مچایا اور اس کو مذہبی مداخلت کا رنگ دیا تو بھی اس نے یہ حکم دیا کہ بغیر مرضی کسی عورت کو زبردستی نہ جلایا جائے۔

ایک اور اصلاح جو اُس نے معاشرہ کو بہتر بنانے کی غرض سے کی یہ تھی کہ لڑکوں کو زنخہ بنانے کے خلاف حکم جاری کیا۔ یہ نہایت قبیح رسم تھی اور بہت پھیل گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک اہم اصلاح تھی۔

عالمگیر کے خلوص اور عقیدے کی پختگی کا ثبوت ہم کو اس چیز میں ملتا ہے کہ اس نے اپنی حکومت کے نقصان کی پروا نہ کرتے ہوئے بہت سے محصول اور ابواب بند کر دیے جن کے لئے کوئی جواز نہ تھا، کھانے پینے کی چیزوں پر راہداری اور چنگی کے نام سے جو محصولات لئے جاتے تھے وہ ختم کر دیے گئے۔

ہندوؤں کے گھاٹوں پر نہانے اور مردوں کی ہڈیوں کو دریا میں پھینکنے پر بھی محصول لیا جاتا تھا۔ یہ بھی بند کر دیا گیا۔ یقیناً اس سے حکومت کو نقصان ہوا لیکن اس کی نظر میں یہ اصلاح ضروری تھی۔

موسیقی کا ایک جنازہ بھی نکالا۔ لیکن بادشاہ نے اس کی پرواہ نہیں کی، اس کے خیال میں اس قسم کی محفلوں سے قومی کردار پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ (مآثر الامرا۔ خافی خاں)

بادشاہ کو سونے اور چاندی میں تولنے کی بھی ایک عرصہ سے رسم جاری تھی عالمگیر نے اس رسم کو یکسر ختم کر دیا کیونکہ اس سے ایک طرف تو بادشاہ میں غرور پیدا ہوتا تھا اور دوسری طرف بعض جاہل لوگ اسکو عبادت سمجھنے لگے تھے۔

اسی طرح جھروکہ سے درشن کی رسم خالص ہندوانہ تھی، ہندو لوگ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کی شکل اگر صبح کے وقت دیکھ لی جائے تو دن بھر خوشیاں حاصل ہوتی رہیں گی۔ عالمگیر ایسی ضعیف الاعتقادی کو پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ یہ سلسلہ بھی بند کر دیا گیا۔

کچھ اور بھی ہندوانہ رسمیں تھیں جو اکبر کے زمانہ سے درباری زندگی میں جگہ حاصل کر چکی تھیں۔ مثلاً دسہرہ کو بحیثیت تہوار منانا۔ پہلے تو عالمگیر نے اس میں خود شریک ہونا ترک کیا، بعد میں اس کو قطعی طور پر بند کرنے کا حکم دے دیا۔

ایک اور رسم یہ تھی کہ ہندو راجاؤں کی تخت نشینی کے بعد بادشاہ ان کی پیشانی پر قشقہ لگاتا تھا یہ خالص مذہبی رسم تھی اس لئے اس کو جاری رکھنے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ اور ۱۶۷۵ء میں بند کر دی گئی۔ (مآثر الامرا)

اپنی حکومت کے بارھویں سال میں اس نے درباری جوتشیوں کو بھی ختم کیا کیونکہ جوتش میں اس کو اعتقاد نہ تھا۔ اور تخت نشینی کے اکیسویں سال میں اس نے یہ حکم دیا کہ سونے اور چاندی کے بنے ہوئے عود دان دربار میں استعمال نہ کئے جائیں اور نیز امراء کو بہت ہی لمبی عبائیں اور داڑھیاں رکھنے اور پہننے کو منع کر دیا کیوں کہ یہ شریعتِ اسلامی کی رو سے ناجائز اور رسول پاک اور خلفائے راشدین کی

معاشری اصلاحات کے سلسلہ میں فحاشی کو بند کرنے کی بھی کوشش کی اور طوائفوں کو حکم دیا گیا کہ وہ شادیاں کریں، لیکن مورخوں کا بیان ہے اور غالباً یہ صحیح ہے کہ اس کے نفاذ میں اس کو صرف ایک حد تک کامیابی ہوئی، پھر بھی یہ اقدام یقیناً قابل تحسین تھا۔

بعض ایسے احکام کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جن کی سیاسی اہمیت تو نہ تھی لیکن سماج پر ان کا اثر ہوتا تھا۔ سماع صوفیاء کے نزدیک جائز بلکہ اچھا ہے لیکن اس سلسلے میں بزرگوں کے مزارات پر لوگ ایسی حرکات کرتے تھے جو کسی طرح قابل تعریف نہیں کہی جا سکتی تھیں اس لئے اس نے اس کے خلاف احکام جاری کئے۔ مگر جو مشائخ قاعدہ کے اندر گانا سنتے تھے وہ مستثنیٰ تھے۔

سونے اور چاندی کے تاروں سے بُنے ہوئے کپڑے مردوں کے لئے ناجائز قرار دئے گئے۔ کیوں کہ ان سے اُن کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ اس زمانے میں یہ بھی طریقہ تھا کہ دشمنوں کی ہڈیوں سے خنجروں اور تلواروں کے دستے تیار کئے جاتے تھے۔ عالمگیر نے اس رسم کو بھی روک دیا۔

عالمگیر کی معاشری اور اخلاقی اصلاحات جو مختصراً بیان کی گئی ہیں اس سے ہم اس کے خیالات کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مورخ کے لئے اس شہنشاہ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ان احکام کی پابندی خود بھی کی جو دوسروں کے لئے جاری کئے۔ اسلام نے سادگی پر بہت زور دیا ہے عالمگیر نے اس کی کیسی نایاب مثال قایم کی اس کو ہم اس کی طرز زندگی میں دیکھ سکتے ہیں، وہ بیت المال کا روپیہ اپنے اوپر خرچ نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ قرآن شریف لکھ کر اور معمولی ٹوپیاں سی کر جو تھوڑا بہت کما لیتا تھا وہی اپنے خرچ میں لاتا تھا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ شاہی پوشاک کے نیچے وہ انتہائی موٹے اور سستے کپڑے پہنتا تھا۔ مرنے سے پہلے بھی

اس نے وصیت کی کہ اس کی تجہیز و تکفین اسی روپیہ سے کی جائے جو اس نے اس طریقہ سے کمایا تھا۔ اسی طرح کفن بھی نہایت سستے کپڑوں سے تیار کرنیکا حکم دیا تھا۔

بعض مورخوں نے ان اصلاحات کا ذکر کر کے صرف یہ کہدیا ہے کہ وہ بادشاہت کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن یہ ان کی تنگ نظری ہے۔

اس کی جاری کردہ اصلاحات ممکن ہے اس حد تک کامیاب نہ ہوئی ہوں جتنی کہ اس کی خواہش تھی، لیکن اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے بگڑتے ہوئے معاشرے کو سنبھالنے کی زبردست کوشش کی۔ اس کی موت کے بعد ہمارا معاشرہ انحطاط پذیر ہوا۔ لیکن اگر عالمگیر اصلاح کی کوشش نہ کرتا تو یقیناً اس کی حالت بہت زیادہ خراب اور قابلِ افسوس ہوتی۔

(بقیہ - مرشد قلی خاں صفحہ ۸۵)

حوادثِ زمانہ سے پامال ہوئے تھے اور مغلوں کے تسلط سے فرار ہو گئے تھے، انکی ہر طرح دلجوئی و دستگیری کی مالی امداد کر کے انکو کاشت کے قابل بنایا قحط کی بلاؤں سے جو دیہات ویران ہو گئے تھے انکو از سرِ نو آباد کیا جن دیہات میں پٹیل پٹواری لاپتہ ہو گئے تھے انکی بازیافت کی اور انکو کام پر لگایا جن لوگوں کا پتہ نہیں چلا وہاں پر تجربہ کار شخص متقرر کئے اسطرح ہر گاؤں میں زندگی پیدا کردی۔ اسکے علاوہ کاشتکاروں کو سرکاری خزانہ سے تقاوی کی رقمیں دلائیں تاکہ وہ ضروری ہل اور جانور خریدیں اور کاشت کو آگے بڑھائیں[1]۔ یہ ہمارے کاشتکار بے دست و پا تھے انکے ہاں ہل تھا نہ جانور اب کاشت ہو تو کیونکر ہو اس ضروری امداد سے کاشتکاروں میں جان آگئی گاؤں آباد ہوئے اور ہر جگہ ہرے بھرے کھیت نظر آنے لگے یہ تھے وہ مرشد قلی خاں جن کی حسن تدبر اور دلسوزیوں کی بدولت ویران گاؤں آباد ہوئے بےچراغ گھر روشن ہوئے ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے۔ اور ہر طرف ہرے بھرے کھیت لہرانے لگے۔

---

[1] مآثر الامرا جلد دوم ص ۴۹۷ منتخب اللباب جلد اول ص ۳۲۔

گورو گوبند سنگھ جی اور اورنگ زیب

سکھوں کے دسویں گورو گوبند سنگھ جی ہوئے ہیں۔ آپ کا اصل نام جو آپ کے والدین نے تجویز کیا تھا گوبند رائے یا رائے گوبند تھا۔ جسے بعد میں انہوں نے خود گوبند سنگھ میں تبدیل کر لیا۔ آپ گورو تیغ بہادر جی کے اکلوتے فرزند تھے۔ سکھوں میں آپ کو "کلغیدھر" "دسمیش پتا" "باز اں والا گورو" اور "گوجاں والا گورو" کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ بعض سکھ ودوان تو کسی دعویٰ اور دلیل کے بغیر آپ کو "آخری نبی" کا لقب دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جیسا کہ ایک سکھ ودوان سردار رندھیر سنگھ جی ہسٹری ریسرچ سکالر شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر نے بیان کیا ہے کہ

"خالصہ (مکمل انسان) کے بلند خیال کے خالق" آخری نبی"

ایک سکھ ودوان کا بیان ہے کہ گورو نانک صاحب سے لے کر گورو گوبند سنگھ جی تک خود کو ٹھاکر یا اوتار یا رسول کچھ بھی نہیں کہتے تھے اور اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ خالصہ سماچار امرتسر ۲۰ نومبر ۱۹۵۵ء

۲ـــ سنیہو مورت ص ۵

گوبند سنگھ جی کے ظاہرہ درشن ہیں ان کی تصنیف (دسم گرنتھ) سے ہوئے ہیں لے۔"

آپ کی زندگی کے حالات جو ہم تک پہونچے ہیں اب وہ بہت ہی عجیب و غریب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک سکھ ددوان اور مصنف نے حقائق سے بے پروا ہو کر اور تاریخ سے بے نیاز ہو کر جو دل چاہا لکھدیا۔ اور اسے تاریخ کا درجہ دے دیا۔ اسی سلسلہ میں ایک سکھ ددوان رقمطراز ہے کہ۔

"سکھ پنتھ میں سارے قابلِ احترام گورو صاحبان میں سے صرف گورو گوبند سنگھ جی ہی ایسے گورو ہوئے ہیں جن کی ہر بات اور ہر عمل سے متعلق سکھ تاریخ میں بحث ہے..... گورو گوبند سنگھ جی جس طرح کے تھے اس طرح کے نہیں، کہ جس طرح کے موجودہ مورخین آپ کو پیش کرنا چاہتے ہیں اس طرح کے ہیں تقریباً ہر ایک سکھ مورخ نے ہی آپ کے حالات کو اپنے ذاتی خیالات کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور ہر ایک سکھ محقق نے آپکی زندگی کے فلسفہ کو حسبِ دلخواہ تشریح کر کے ارتھوں کے ارتھ کرنے کی کوشش کی ہے تاریخ کی موجودہ کتب کے مطالعہ سے آپ کی شخصیت واضح طور پر سامنے نہیں آتی۔ آپ کی زندگی کا کوئی بھی بڑا واقعہ صحیح رنگ میں بغیر کمی بیشی کے پڑھنے کے لئے نہیں ملتا۔ موجودہ سکھ تاریخ کے مطابق آپ کی تمام زندگی اور زندگی کا تمام

لے ہفت روزہ اخبار پنتھ پرکاش بسا کھی نمبر ۱۹۶۵ء

فلسفہ متضاد باتوں سے بھرپور ہے[1]۔"

اس صورت میں آپ کے سوانحی حالات کے بارے میں کسی کے لئے کوئی رائے قایم کرنا اور اس سے نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل ہے۔

آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگ وجدل میں گزرا ہے آپ نے اپنے عقیدتمندوں کو بھی ایک جنگی ٹولہ کی شکل دیدی تھی۔ گوردوارہ ٹریبونل کے ایک فاضل جج آپ سے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ۔

"گورو گوبند سنگھ نے گورو ہر گوبند کے ظاہر کردہ خیالات کا پرچار کرتے ہوئے اپنے اندولن کو سیاسی فوجی اور اسلام کے خلاف بنا دیا[2]۔"

مشہور مورخ گیانی گیان سنگھ جی نے اس سلسلہ میں یہ بیان کیا ہے کہ۔

"گورو گوبند سنگھ ایک نہایت بیدار مغز اور عالی دماغ بیشوا تھے۔ جب ہزارہا آدمی امرت چکھ چکھ کر ان کے پیرو ہو گئے تو قبل اس کے کہ وہ اپنا کام شروع کریں انہوں نے اپنے مریدوں کو جو براہمنوں کی کرپا سے ساگ پات کھا کھا کر بالکل گؤ ماتا بنے ہوئے تھے جنگ وجدال جیسے مشکل کاموں میں مشاق بنانا چاہا۔ اور اس کے لئے سوائے اس کے اس وقت کوئی دوسری عمدہ ترکیب نہیں تھی کہ وہ پہاڑی راجاؤں کے ملک میں جنہوں نے ان کے مذہب کی پیروی سے انکار کیا تھا دور دور نکل جایا کریں اور لوٹ مار کر کے چھاپے مارنے

---

[1] بحفت روزہ اخبار پنتھ پرکاش بیساکھی نمبر سنہ ۱۹۶۵ء [2] سدھ ادای سکھو رمین ص ۲۲

اور جنگ وجدل میں مہارت حاصل کریں، شکار کھیلیں
اور گنگا جل (شراب) پئیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا[1]"

گورد گوبند سنگھ جی کی تمام زندگی جنگ وجدل اور کشت و خون ہی میں گزری ہے۔ ایک سکھ ودوان رقمطراز ہیں کہ۔

"ہندو دھرم کی حفاظت اور سکھ جماعت کے قیام کے لئے گورو گوبند سنگھ جی کو مغل حکومت سے اعلانیہ جنگ کے پروگرام پر عمل کرنا پڑا...... گورد گوبند سنگھ جی نے اپنے جنگ وجدل میں ملکی فتوحات حاصل نہیں کیں[2]"

اس سے ظاہر ہے کہ گورد گوبند سنگھ جی نے ہندو دھرم کی حفاظت میں اورنگ زیب کے خلاف جنگ کی۔ گویا کہ آپ ہندو دھرم کے محافظ تھے۔

لیکن اس کے برعکس ایک سکھ ودوان نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ۔

"ہندو دھرم کا محافظ یہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ"
منم کشتنم کوہیاں بت پرست کہ اُو بت پرست دمن بت شکست[3]"

ایک اور سکھ ودوان نے اس بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ۔

تاریخ سے واقف جانتے ہیں کہ گورد گوبند سنگھ جی کا شاہ اورنگ زیب سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔ یہ تمام سازش ہندوؤں ہی کی تھی۔ جب ہندوؤں نے سوچا کہ گورد گوبند سنگھ جی ہندو حکومت کا خاتمہ کر رہے ہیں۔.. تب.... صاحب گورو گوبند

---

[1] تواریخ گورو خالصہ اُردو۔ ص ۱۵۱ [2] رسالہ سنت سپاہی امرتسر فروری ۱۹۵۷ء
[3] اخبار فتح کلغیدھر نمبر ۱۹۵۹ء

سنگھ جی مہاراج اور اورنگ زیب کے درمیان لڑائی کی بنیاد قایم کی۔ گورو گوبند سنگھ صاحب خود اپنے ظفرنامہ میں لڑائی کا سبب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

منم کشتنم کوہیاں بت پرست کہ آں بت پرستند ومن بت شکست[1]

سکھ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں تو پہاڑی راجے اور گورو گوبند سنگھ جی آپس میں نپٹتے رہے۔ اور پہاڑی راجے اس امر میں کوشاں رہے کہ وہ کسی طرح گورو جی کو انند پور سے بے دخل کر دیں۔ مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ انہیں الٹا نقصان اٹھانا پڑا آخرکار جب لڑائی پہاڑی راجاؤں سے قابو سے باہر ہو گئی تو وہ صوبہ دار سرہند کے پاس فوجی امداد حاصل کرنے کے لئے گئے صوبہ دار سرہند نے ان سے خرچ وصول کر کے ان کی فوجی امداد کی چنانچہ مشہور سکھ مورخ گیانی گیان سنگھ جی بیان کرتے ہیں کہ۔

"جب پہاڑی راجاؤں نے دیکھا کہ سکھوں کو شکست دینا ان کے بس کی بات نہیں تو فوراً صوبہ دار سرہند کے قدموں پر جا گرے اور بیس ہزار روپیہ خرچ کا ادا کر کے کمک کے خواہاں ہوئے الغرض صوبیدار سرہند نے بہت سی فوج دے کر راجہ بھیم چند کی مدد کی۔"[2]

ایک اور سکھ ودوان رقمطراز ہیں کہ۔

"اس شکست سے شرمندہ ہو کر صوبیدار سرہند کو بیس ہزار روپیہ اور راجہ بھیم چند نے اپنے خاندان میں سے ایک

---

[1] سکھ ہندو نہیں ص ۲۰ [2] تواریخ گورو خالصہ ص ۱۵۳

راجپوت لڑکی کا رشتہ دینا طے کرکے اپنی امداد پر گورو صاحب کے
خلاف چڑھائی کرکے لے آیا[1]"۔

پہاڑی راجاؤں کا خرچ ادا کرکے حکومت سے فوجی امداد حاصل کرنا اس امر کو واضح کر رہا ہے کہ حکومت کا گورو جی سے براہ راست کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ حکومت کو پہاڑی راجاؤں کی درخواست پر ان کی امداد کے لئے میدان میں آنا پڑا۔ ایک ہندو ودوان مہاشہ سنت رام نے حکومت کی اس امداد کے بارے میں ... بیان کیا ہے کہ

"گوبند سنگھ جی نے بلا تمیز ہندو اور مسلمان کے لڑائیاں کیں بلکہ زیادہ تر ان کی جنگ ہندوؤں کے ساتھ تھی مسلمان حاکموں کو صرف ہندوؤں کی مدد کے لئے شامل ہونا پڑا۔ اور ان کا اخلاقی فرض تھا کہ اپنے ماتحت اور کمزور ہمسایہ حکومتوں میں امن و امان قایم رکھیں[2]۔"

اس طرح صوبہ سرہند کی طرف سے پہاڑی راجاؤں کا پلہ بھاری ہوگیا اور گورو صاحب کو انند پور چھوڑنا پڑا۔

اس بارے میں ایک سکھ ودوان کا یہ بیان ہے کہ۔

"متعدد ہندو اہلکار، سرکاری خوشامدی اور بہت سے راجپوت راجے بھی گورو صاحب کے خلاف لڑے تھے[3]۔"

ایک سکھ ودوان نے پہاڑی راجاؤں اور گورو گوبند سنگھ جی کی ان لڑائیوں کا سبب بیان کیا ہے کہ۔

---

[1] ظفر نامہ مترجم ص ۶ [2] ہندو جاتی اور سکھ گورو ص ۶

[3] رسالہ سنت سپاہی امرتسر فروری و اپریل ۱۹۶۰ء

پہاڑی راجاؤں کو آپ نے غیر ملکی مغلوں کی حکومت کے......
خلاف بہت اُبھارا...... کئی مرتبہ پہاڑی راجے مانے بھی
مگر حکومت کی طاقت دیکھ کر پھر مغلوں سے مل جاتے تھے
اور الٹی گورو جی کی شکایات کرتے تھے[1]۔

الغرض اس حقیقت سے کسی بھی محقق کو انکار نہیں ہو سکتا کہ گورو گوبند سنگھ جی اور اورنگ زیب یا اس کی حکومت سے براہ راست کوئی جھگڑا نہ تھا۔ جب گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے ارد گرد شاہی باغی اور اوباش جمع کر کے پہاڑی راجاؤں کے علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تو حکومت کو مجبوراً دخل دینا پڑا۔ اور حکومت کو یہ دخل بھی پہاڑی راجاؤں کی درخواست پر دینا پڑا، اور ان سے خرچ وصول کیا گیا۔

گیانی گیان سنگھ جی نے گورو صاحب موصوف کے ارد گرد جمع ہونے والے لوگوں کا تعارف حسب ذیل الفاظ میں کرایا ہے کہ

"شاہی باغی ٹھاٹھ کاٹھ دھاڑدی لوگ بھی گرو جی کے پاس
اس وقت بہت آ گئے تھے اور وہ ہر وقت یہی چاہتے تھے کہ
کسی نہ کسی طرح فساد پیدا ہو[2]۔"

اس جنگ وجدل اور لڑائی جھگڑوں میں گورو صاحب کو کافی نقصان اٹھانا پڑا جب گورو صاحب کے اس نقصان کا اورنگ زیب کو علم ہوا تو اسے اس کا بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ اس نے بقول سکھ ودوانوں کے گورو جی کو یہ مراسلہ بھیجا کہ۔

"میرے عملہ نے بت پرست پہاڑی راجاؤں کے کہنے پر سختی کی ہے

---

[1] رسالہ سنت سپاہی امرتسر فروری و اپریل ۱۹۶۰ء [2] تواریخ گورو خالصہ ص ۱۰۰۴

جس کی سزا میں انہیں خود دہلی آ کر دونگا آپ جسقدر جلد ہو سکے
میرے پاس آئیں[1]"

اس کے علاوہ گیانی جی نے بیان کیا ہے کہ اورنگ زیب نے پنجاب کے تمام حکام کو بھی لکھدیا کہ گورو صاحب کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔ اور اس کی اطلاع بادشاہ نے گورو صاحب کو بھی کر دی جیسا کہ گیانی جی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے گورو صاحب کو یہ بھی لکھا کہ۔

"میں نے کل حاکمان پنجاب کے نام احکام جاری کر دئے ہیں۔
امید ہے کہ آئندہ آپ سے کوئی مقابلہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ
ایسا ہی ہوا[2]"

اس کے علاوہ اورنگ زیب نے گورو صاحب کو یہ مراسلہ بھی بھجوایا کہ۔

"ہند کے پیر جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں کیوں کہ شہنشاہ دہلی کو
ان کے معصوم بچوں، امت اور بے شمار دولت کے برباد
ہونے کا افسوس ہے[3]"

ایک سکھ ودوان پروفیسر کرتار سنگھ جی۔ ایم اے بیان کرتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اس سلسلہ میں ایک فرمان صوبیدار سرہند کے نام بھی جاری کیا تھا جیسا کہ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"اس نے سرہند کے نواب کو ایک چٹھی لکھی جس میں اس کی
زیادتیوں پر ناراضگی کا اظہار کیا اور اسے تنبیہ کی کہ آئندہ

---

[1] تواریخ گورو خالصہ ص ۱۳۶۶ [2] تواریخ گورو خالصہ اردو ص ۱۸۷
[3] رسالہ ایڈیشنک امرتسر جنوری ۱۹۳۲

گورو جی کو تنگ نہ کیا جائے[1]۔"

مشہور سکھ مورخ گیانی گیان سنگھ جی بیان کرتے ہیں کہ اورنگ زیب نے جواب طلبی بھی کی تھی کہ اس نے گورو صاحب کے خلاف فوج کشی کیوں کی جیسا کہ گیانی جی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے صوبہ سرہند کو لکھا تھا کہ۔

"آپ نے نانک شاہ خدا پرست پیر کے گدی نشین پر پہاڑی بت پرست راجاؤں کے کہنے پر..... فوج کشی کیوں کی تھی کیونکہ جب اس نے شاہی نقصان کوئی نہیں کیا تھا تو آپ نے ناحق کروڑوں اور ہزاروں آدمی شاہی کیوں ضائع کروا دئے؟ یہ بہت بُرا کام کیا ہے۔ اور آپ کو کونسا ملک۔ اور خزانہ حاصل کرنا تھا جو اتنی بڑی لڑائی چھیڑ دی۔ اس کا جواب صحیح طور پر دو اور آئندہ کے لئے اس پیر کی طرف کبھی بھی بُری آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا۔ جہاں اس کا دل چاہے سکونت اختیار کرے[2]۔"

اورنگ زیب بادشاہ کا صوبہ سرہند سے یہ جواب طلبی کرنا واضح کرتا ہے کہ گورو صاحب کا حکومت سے کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ پہاڑی راجاؤں سے ان کا ذاتی تنازعہ تھا اور وہ آپس میں الجھ رہے تھے۔

سکھ مورخین بیان کرتے ہیں کہ گورو گوبند سنگھ جی نے اورنگ زیب کے نام ایک چٹھی بھی ارسال کی تھی جسے سکھوں میں ظفر نامہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس چٹھی میں گورو صاحب نے علاوہ اور باتوں کے پہاڑی راجاؤں سے جھگڑے کی وضاحت بھی

---

[1] جیون کتھا گورو گوبند سنگھ جی ص ۳۵۲

[2] تواریخ گورو خالصہ ص ۱۳۶۶

کی تھی اس کے جواب میں بادشاہ نے گورو صاحب کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اور ان پر زیادتیاں کرنے والے لوگوں کے لئے باہمی گفتگو سے سزا تجویز کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا[۱]

ایک اور سکھ ودوان بیان کرتے ہیں کہ اورنگ زیب نے دہلی کے وزیر کے نام مراسلہ جاری کیا تھا کہ۔

"گوروجی کو تنگ نہ کیا جائے اور انہیں دکن آنے کے لئے کہا جائے[۲]"

ایک اور سکھ ودوان بابو تیجا سنگھ جی بیاں کرتے ہیں کہ۔

"مورخین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس ظفر نامہ کے پڑھنے کے بعد بادشاہ نے..... پنجاب کے تمام حکام کے نام شاہی فرمان جاری کیا کہ آئندہ گوروجی پر کوئی چڑھائی نہ کی جائے۔ اور گوروجی کی طرف بھی گرزبردار کے ذریعہ شاہی مراسلہ ارسال کیا کہ جس میں مرقوم تھا کہ آپ جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں۔ اور ان حاکموں کو جنہوں نے اس کے عہد کو توڑ کر گوروجی کے خلاف فوج کشی کی تھی مناسب سزا دینے کا بھی ذکر تھا[۳]"

ایک اور سکھ ودوان رقمطراز ہیں کہ۔

"اس ظفر نامہ کو پڑھ کر اورنگ زیب کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ اُسے گوروجی پر کی گئی سختی کا افسوس ہوا۔ اسنے بھائی دیا سنگھ اور بھائی دھرم سنگھ جی کو دجو گورو صاحب

---

[۱] وسان گوروآں دا جیون چرتر ص ۵۶ [۲] گورمت لیکچر ص ۲۰۶

[۳] ظفر نامہ مترجم ص ۱۲۰

کی یہ چٹھی لے کر اس کے پاس گئے تھے) صحیح سلامت اور بغیر
کسی روک ٹوک کے دلیس جانے کا پروانہ دے دیا اس کے
علاوہ اس نے اپنے اہلکاروں اور تابعداروں کے نام
حکم جاری کیا کہ گورو جی سے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا جائے۔
اور نہ انہیں کوئی تکلیف دی جائے۔ اور وہ جہاں چاہیں ہیں
اور انہیں آنے جانے کی بھی پوری آزادی، دی جائے۔"

اس کے بعد گورو گوبند سنگھ جی اورنگ زیب سے ملنے کے لئے دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی آپ راستہ میں ہی تھے کہ حضرت اورنگ زیب کا وصال ہو گیا۔ اور گورو صاحب اس سے ملاقات نہ کر سکے۔

گورو گوبند سنگھ جی کے چھوٹے بچوں کا قتل

موجودہ زمانے کے اکثر سکھ بغیر کسی پختہ تاریخی ثبوت کے اورنگ زیب کے عہد کا ایک المناک سانحہ، گورو گوبند سنگھ جی کے دو چھوٹے بچوں۔ صاحبزادہ زورآور سنگھ اور صاحبزادہ فتح سنگھ کا قتل بھی بیان کرتے ہیں گو اس سانحہ سے متعلق سکھوں کی بیان کردہ روایات کی رو سے بھی حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیرؒ کا اس سانحہ سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تاہم یہ حقیقت ہے کہ تمام سکھ اس کی بناء پر اورنگ زیب جیسے روشن ضمیر اور ملائک صفت بادشاہ کو پانی پی پی کر کوستے رہتے ہیں کہ اس کے عہد میں گورو صاحب موصوف کے دو چھوٹے شیر خوار اور معصوم بچے صوبیدار سرہند کے حکم سے زندہ دیوار میں چنوا دئے گئے تھے۔ اور ختم کر دئے گئے تھے ان کا قصور یہ اور صرف یہ تھا کہ وہ گورو گوبند سنگھ کے بچے ہیں اور اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس واقعہ کو مزید دردناک بنانے کے لئے عجیب و

عزیب باتیں بھی گھڑلی گئی ہیں۔ اور یہاں تک لکھنے کی جسارت کی ہے کہ۔

"چھوٹے صاجزادے فتح سنگھ جی اور چھوٹے معصوم جوجھار سنگھ[۱] جی کو بنیادوں میں چن کر ختم کر دینے کی کہانی سن کر کٹھور اورنگ زیب بادشاہ بھی کانپ گیا تھا۔ اس کا دل دہل گیا تھا۔ جب اس نے یہ پاپ بھری کہانی سنی تو وہ چارپائی پر بیمار تھا اور اس خبر کو سنتے ہی اس کا دل لرز گیا......اورنگ زیب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے[۲]۔"

حقیقت یہ ہے کہ گورو صاحب کے کسی صاجزادے کو کسی بھی مسلمان نے دیواریں نہیں چنا تھا یہ محض ایک فرضی افسانہ ہے اور اورنگ زیب کے آنسو جاری ہونے والی بات تو اور بھی من گھڑت ہے۔ جب گورو جی کے کسی بھی بچہ کو اس قسم کی سزا نہیں دی گئی تو اورنگ زیب کا اس سانحہ کو سن کر آنسو بہانا تو بالکل بے معنی اور مضحکہ خیز ہے۔

جہانتک پراچین سکھ کتب کا تعلق ہے ان سے کہیں بھی ثابت نہیں کہ صوبیدار سرہند نے

---

[۱] سکھ ودوانوں کا اس امر میں بھی شدید اختلاف ہے کہ سرہند میں کام آنے والے گورو جی کے بچوں کے کیا نام تھے۔ بعض نے ان کا نام زور آور سنگھ اور فتح سنگھ اور بعض نے جوجھار سنگھ اور فتح سنگھ بیان کئے ہیں۔ نیز بھائی ویر سنگھ جی نے تو یہ بھی بیان کیا ہے کہ۔
"یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جوجھار سنگھ اور زور آور سنگھ ایک ہی صاجزادے کے دو نام ہیں۔ ایک نام ہے اور دوسرا لقب ہے۔" گوربلاس سورج گرنتھ سمپادت ص ۴۸۸۷۔

[۲] رسالہ خالصہ پارلیمنٹ گزٹ دسمبر ۱۹۶۱ء

گورو گوبند سنگھ جی کے دو چھوٹے صاحبزادے زور آور سنگھ اور فتح سنگھ کو زندہ دیوار میں چنوا دیا تھا۔ خود سکھوں میں بھی ایسے ودوان اور فضلا موجود ہیں جو اس روایت کی صحت کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک گورو صاحب موصوف کے ان چھوٹے بچوں کے زندہ دیوار میں چنوائے جانے کی کوئی تاریخی سند نہیں۔ کیونکہ پراچین سکھ لٹریچر میں اسکا کوئی ذکر نہیں جیسا کہ ایک سکھ ودوان کا بیان ہے۔

"دیوار میں چنے جانا کا کوئی واقعہ گورپرتاب سورج گرنتھ میں
نہیں ہے۔ لیکن آج کل عام شہرت ہے[1]"

گورپرتاب سورج گرنتھ سکھ حکومت کے زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس میں اس واقعہ کا درج نہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ روایت ابھی مشہور نہیں ہوئی تھی یعنی اس زمانہ کے سکھ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ گورو صاحب کے دو چھوٹے بچے صاحبزادہ زور آور سنگھ اور صاحبزادہ فتح سنگھ زندہ دیوار میں چنوا دیے گئے تھے۔ ورنہ یہ ناممکن تھا کہ بھائی سنتوکھ سنگھ ایسا سکھ بزرگ اور مورخ اپنی مشہور و معروف تصنیف گورپرتاب سورج گرنتھ اس سانحہ کا کوئی تذکرہ نہ کرتا۔ پس اس کے صاف معنی یہی ہیں کہ بھائی سنتوکھ سنگھ جی کے زمانہ تک کے سکھوں نے اس روایت کو نہیں اپنایا تھا۔ یاد رہے کہ بھائی سنتوکھ سنگھ جی کی تصنیف گورپرتاب سورج گرنتھ سنہ ۱۹۰۰ بکرمی (۱۸۴۳ء) میں مکمل ہوئی تھی[2]

بھائی سنتوکھ سنگھ جی کی تصنیف گورپرتاب سورج گرنتھ تک ہی محدود نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۸۴ بکرمی (۱۸۲۷ء) سے قبل کی کسی بھی سکھ کتاب یا گرنتھ میں خواہ وہ

---

[1] جنم ساکھی بھائی بالا۔ ص ۶۵۹ [2] مہان کوش۔ ص ۱۸۳۔ سکھ دتیاس دانشٹ لویں گورپرتاب سورج گرنتھ سمپادنتا۔ ص

مستند ہے یا غیر مستند اس واقعہ کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا کہ صوبیدار سرہند نے گورو گوبند سنگھ جی کے دو چھوٹے بچے زندہ دیوار میں چنوا دیے تھے۔ سکھ ودوانوں کو بھی یہ تسلیم ہے کہ سب سے پہلے یہ روایت بھائی ویر سنگھ جی نے اپنی غیر معروف کتاب "سنگھ ساگر" قلمی میں بیان کی ہے۔ چنانچہ مشہور سکھ سکالر سردار تیجا سنگھ جی ایم۔ اے (پرنسپل) رقمطراز ہیں کہ۔

"۱۸۲۷ء میں بھائی ویر سنگھ پٹیالے والے نے "سنگھ ساگر" گرنتھ لکھا جس میں مرقوم ہے کہ صاحب اجیت سنگھ چمکور میں شہید ہوئے اور فتح سنگھ اور زور آور سنگھ سرہند میں ناظم کے حکم سے بنیادوں میں چنوائے گئے۔"[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پرنسپل تیجا سنگھ جی ایم اے ایسا مشہور و معروف ودوان اور اسکالر اس امر کا معترف ہے کہ ۱۸۸۴ بکرمی (۱۸۲۷ء) سے قبل کی کتب میں اس روایت کا کوئی ذکر نہیں کہ گورو صاحب کے دو چھوٹے بچے اسلام قبول کرنے سے انکار کے جرم میں زندہ بنیادوں میں چنوا دیے گئے تھے۔ بھائی ویر سنگھ جی، مصنفہ "سنگھ ساگر" نے یہ روایت کہاں سے نقل کی ہے اس کا کوئی پتہ نہیں دیا گیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سکھ لٹریچر کی مشہور و معروف اور مقدس کتاب دسم گرنتھ اور دوسری سکھ کتب، واراں بھائی گرداس، گور سوبھا، گرنتھ جگت، رتناولی، مہا پرکاش، گور بلاس، پاتشاہی دس اور بنساولی نامہ وغیرہ میں بھی اس روایت کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ پرنسپل تیجا سنگھ جی نے اس بارے میں یہ شہادت دی ہے کہ اس سانحہ کے قریب زمانہ کی کتب میں ان بچوں کے دیوار میں چنے جانے کا ذکر نہیں۔ البتہ۔

---

[1] رسالہ کومل سنسار امرتسر۔ جنوری ۱۹۴۰ء

"بعد کی کتب میں بنیادوں میں چنے جانے کا ذکر ہے ..... اگر
وہ بچے قلعہ کی بنیادوں میں چنوائے جاتے تو چاہیئے تھا کہ موجودہ
سنجی صاحب کا یادگاری استھان قلعہ کی کسی دیوار پر ہوتا[1]"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ گورو گوبند سنگھ جی کے چھوٹے صاحبزادوں کا سرہند میں زندہ بنیادوں میں چنوایا جانا کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ۱۸۸۳ء بکرمی (۱۸۲۶ء) میں سکھ کتب میں داخل کیا گیا۔ یعنی سب سے پہلے اسے بھائی ویر سنگھ جی نے اپنی تصنیف "سنگھ ساگر" میں جگہ دی۔ ان سے قبل کی کسی سکھ کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ گورو گوبند سنگھ جی نے خود بھی اس کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ کہ ان کے دو چھوٹے شیر خوار بچے صوبیدار سرہند کے حکم سے زندہ بنیادوں میں چنوا دیئے گئے تھے۔

سکھوں میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اس واقعہ کی صحت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے نزدیک یہ ناممکن بات ہے۔ چنانچہ ایک سکھ ودوان نے موجودہ زمانہ کی نئی روشنی کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذکر میں بیان کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ بات نہیں آسکتی کہ گورو صاحب کے چھوٹے بچوں نے خود کو دیوار میں چنوا دیا تھا۔ جیسا کہ مرقوم ہے کہ۔

"یہ بات کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ چھوٹی سی معصوم عمر کے بچے
زندہ کھڑے ہو کر خود کو بنیادوں میں چنوا دیں[2]"

جو لوگ اس فرضی من گھڑت قصہ کو ایک تاریخی واقعہ کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اس کی بنا پر صوبیدار سرہند اور اورنگ زیب بادشاہ کو پانی پی پی کر کوستے ہیں انہوں نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ایک دوسرے کے متضاد باتیں جمع کر دی ہیں۔

---

[1] رسالہ کول سنسار۔ امرتسر۔ جنوری ۱۹۴۳ء [2] رسالہ خالصہ پارلیمنٹ گزٹ فروری ۱۹۵۲ء

ان کی موجودگی میں ہر غیر جانب دار محقق یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ یہ قصہ سرے سے غلط، من گھڑت اور بے بنیاد افسانہ ہے، اس سے زیادہ کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور اسے ان تعدیوں اور ظلموں پر پردہ ڈالنے کے لئے بعد کو وضع کیا گیا ہے۔ جو سکھوں نے بندہ بیراگی اور سکھوں کے زمانہ میں مسلمانوں پر کئے تھے۔

سکھ ودوانوں کی متضاد اور مضحکہ خیز باتیں

گورو گوبند سنگھ جی کے چھوٹے بچوں کے مارے جانے کی حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے سکھ تصانیف کی ورق گردانی کی جائے اور سکھ ودوانوں کے بیانات کا جائزہ لیا جائے تو اس سلسلہ میں بہت سی متضاد اور مضحکہ خیز باتیں سامنے آتی ہیں چنانچہ چند باتیں نمونہ کے طور پر ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

گورو صاحب کے بچوں سے متعلق قاضی کا فتویٰ

ایک سکھ ودوان بیان کرتے ہیں کہ جب گورو صاحب کے بچے صوبہ سرہند کے دربار میں پیش ہوئے تو قاضی صاحب نے ان کے بارے میں یہ فتویٰ دیا کہ۔

"ایک دیوار میں ان دونوں کو دھیرے دھیرے چننے کا حکم دیا جائے...... اگر انہوں نے اپنی بدنصیبی سے دیوار کے اوپر جانے سے بھی (اسلام قبول کرنا) نہ مانا تو شرع محمدی کی رُو سے مارنا تو ان کا لازمی ہے[1]"

ایک اور سکھ ودوان کا بیان ہے کہ قاضی نے ان بچوں کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ۔

"وحید خاں - قاضی جی فتویٰ لگادو!"

---

[1] اتہاس گورو خالصہ ص ۱۱۶

"قاضی۔ زندہ دیوار میں چنوا دو![1]"

ایک اور صاحب رقمطراز ہیں کہ۔

"قاضی نے فتویٰ دیا کہ انہیں بنیادوں میں چنوا دیا جائے۔[2]"

اس کے برعکس سکھوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ بیان کرتے ہیں کہ۔

"قاضی سے کہا گیا کہ وہ فتویٰ دیں۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ قرآن شریف میں معصوموں کو سزا دینا مرقوم نہیں ہے۔ تب نواب نے کہا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔[3]"

یعنی :۔ "شرع تو یہ کہتی ہے کہ معصوم بچوں کو کسی قسم کا دُکھ نہ دیا جائے اور نہ مارا جائے۔[4]"

ایک اور سکھ وِدوان رقمطراز ہیں کہ

"گورو صاحب کے چھوٹے بچوں کو قاضی نے فتویٰ دے کر بری کر دیا تھا۔[5]"

ایک اور سکھ وِدوان نے اس بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ۔

"قاضی نے قرآن شریف کی آیت کا حوالہ دے کر وزیر خاں کو خبردار کیا کہ کسی بے گناہ معصوم پر تلوار کا وار کرنا اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا اسے دوزخ کی آگ میں جلنا ہوگا۔[6]"

---

[1] ہمارے صاحبزادے۔ ص ۱۰۷۔ [2] اکالی پتر کا جالندھر ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۹ء۔ [3] اکالی پتر کا جالندھر ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۹ء۔ [4] اکالی پتر کا جالندھر ۱۹۵۹ء۔ [5] رسالہ سنت سپاہی امرتسر۔ جون ۱۹۵۹ء۔ [6] رسالہ خالصہ پارلیمنٹ گزٹ ۱۹ء

ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ سکھوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں کہ جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قاضی نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے گورو گوبند سنگھ جی کے چھوٹے بچوں کو سزا دیا جانا سراسر ناجائز ہے صوبیدار سرہند نے انہیں بری کر دیا تھا۔

نوعیتِ قتل میں اختلاف جن سکھ مصنفین اور مورخین نے گورو صاحب کے ان دو چھوٹے بچوں کے سرہند میں مارے جانے کا الزام اس وقت کی مسلم حکومت پر لگایا ہے انہوں نے ان کے مارے جانے کے واقعات عجیب و غریب رنگ میں نقل کئے ہیں چنانچہ گورو گوبند سنگھ جی کے ہم عصر لکھتے ہیں کہ "جھو جھت ہی پر لوک سدھائے"[1]

یعنے لڑتے ہوئے اور مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ بعض کا بیان ہے کہ ان کا پیٹ چاک کر دیا گیا تھا[2]۔ بعض کے بیان کے مطابق انہیں پہلے سرہند میں دیوار میں چنوایا گیا تھا اور پھر ذبحہ کر دیا گیا تھا[3]۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ ان کے سر، قتل ہونے سے قبل ہی تن سے جدا ہو گئے تھے[4]۔ ایک اور صاحب رقمطراز ہیں کہ۔

> "پہلے ان کے ہاتھ بارود سے اُڑا دیے گئے۔ پھر انہیں زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا۔ مگر جب جان نہ نکلی تو انہیں قتل کروا دیا گیا[5]۔"

اسی طرح ایک صاحب کا بیان ہے کہ گورو جی کے ان بچوں کو ان کی دادی کے ساتھ ایک ا۔ج میں قید کر دیا گیا۔ اور تین دن رات انہیں بہت تکالیف دی گئیں

---

[1] گورو سوبھا گرنتھ۔ ص [2] اخبار خالصہ سماچار امرتسر ۱۶ مئی ۱۹۳۲ء [3] رسالہ پنجابی دنیا اکتوبر ۱۹۵۶ء

[4] دس گورو جوت پرکاش۔ ص ۶۵۸ [5] گوردوارے درشن۔ ص ۷۵۹۔

اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، اس کے بعد انہیں دیوار میں زندہ چننے کا حکم دیا گیا۔ اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ جب وہ کسی طرح بھی مسلمان بننے کے لئے تیار نہ ہوئے تو انہیں قتل کر دیا گیا اور ان کے سر، صوبیدار سرہند کے روبرو پیش کئے گئے[1]۔ اس کے برعکس ایک صاحب کا یہ بیان ہے کہ پہلے ان بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور بعد کو ان کی لاشیں قلعہ کی بنیادوں میں چن دی گئی تھیں[2]۔ ایک سکھ ودوان تحریر فرماتے ہیں کہ صوبیدار سرہند نے ان بچوں کو دیوار میں چننے کا حکم دیا تھا۔ اور ان کے سر دیواروں پر لٹکا دئے گئے تھے۔ تاکہ تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ گورو صاحب کے بچوں کا یہ حشر ہوا ہے[3]۔ گیانی شیر سنگھ جی کا بیان ہے کہ گورو صاحب کے ان بچوں کو دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا تھا۔ اور جب دیوار ان کے سروں سے اوپر تک پہونچ گئی تو دیوار گرا کر ان کی لاشوں کو نکال لیا گیا تھا[4]۔ لیکن اس کے برعکس گیانی گیان سنگھ جی یہ بیان کرتے ہیں کہ گورو صاحب کے ان بچوں کو دیوار میں زندہ چنا گیا تھا۔ اور دیوار خود بخود پھٹ گئی تھی اور بچے بیہوشی کی حالت میں نکال لئے گئے تھے۔ جنہیں دوائی وغیرہ دے کر ہوش میں لایا گیا تھا۔ اور پھر پانچ دن کے بعد انہیں قتل کروا دیا گیا تھا[5]۔ ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ ان دنوں سرہند کے قلعہ کی تعمیر ہو رہی تھی صوبیدار سرہند نے حکم دیا کہ ان بچوں کو قلعہ کی بنیاد میں چنوا دیا جائے۔ اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ آندھی سے دیوار گر پڑی اور وہ دونوں لاشیں باہر آگئیں[6]۔ یہی صاحب یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جب گورو گوبند سنگھ جی کی والدہ ماجدہ نے ان بچوں کے مارے جانے کی خبر سنی تو انہیں گورو گوبند سنگھ جی کا تراپ

---

[1] گوردوارے درشن۔ ص ۵۹، [2] گورتیرتھ سنگرہ۔ ص ۱۸۹ [3] کلغید ھر بلاس۔ ص ۲۳۹ [4] دھرم دا چھتر ص ۳۲۶۔ دیگ تیغ دا مالک ص ۸۷ [5] پنتھ پرکاش چھاپہ ٹائپ نواس ۲۲۔ ص ۱۴۱ ۲ [6] سری دشمیش چمتکار۔ ص ۴۰۱۔

یاد آگیا۔ اور انہوں نے کہا کہ وہ شراپ پورا ہو گیا ہے[1]۔ اس سے واضح ہے کہ گورو صاحب کے ان بچوں کی موت ان کے اپنے شراپ کا ہی نتیجہ تھی۔

ایک سکھ ودوان نے اس سلسلہ میں یہ بیان کیا ہے کہ جب گورو گوبند سنگھ جی نے انند پور کا قلعہ خالی کر دیا تھا۔ اس وقت پہاڑی راجاؤں نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ اور اس حملہ میں ان کے ہزاروں سکھ اور بچے وغیرہ مارے گئے تھے۔ جیسا کہ مرقوم ہے کہ۔

> "قلعہ سے نکلتے ہی ان بے سخن لوگوں نے گورو صاحب پر حملہ کر دیا اس حملہ میں آپ کے ہزاروں سکھ ماتا اور بچے شہید ہو گئے۔ اور تمام جاہ و جلال جاتا رہا۔ اور آپ بہت مصیبتوں کے منہ میں پھنس گئے[2]"

اس سے ظاہر ہے کہ گورو صاحب کے بچے سرہند میں نہیں مارے گئے تھے بلکہ وہ اس حملہ میں ہزاروں سکھوں کے ساتھ کام آئے تھے۔ جو پہاڑی راجاؤں نے ان کے انند پور خالی کرنے کے موقع پر کیا تھا۔

گورو صاحب کے بچوں کے مارے جانے کی خبر گورو صاحب تک کس نے پہونچائی

سکھ مورخین کا اس بارے میں بہت اختلاف ہے کہ سرہند کے اس واقعہ کی خبر گورو گوبند سنگھ جی تک کس نے پہونچائی تھی۔ چنانچہ بعض نے تو صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ ایک سکھ نے گورو صاحب کے پاس آکر بتایا تھا کہ سرہند میں ان کے دو بچے مارے گئے ہیں[3]۔

لیکن بعض کے نزدیک یہ خبر سنانے والا "نورا" نام کا ایک شخص تھا اس نے

---

[1] سری اویشش چمتکار۔ ص ۱۹۱م [2] رسالہ سنت سپاہی امرتسر۔ اپریل ۱۹۵۸ء

[3] پراچین پنتھ پرکاش۔ ص ۹۷۔

گورو صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں سرہند میں ان کے دو بچوں کے مارے جانے کا پتہ دیا تھا[۱]

بعض کا بیان ہے کہ گورو جی نے خود "ماہی" نام کے ایک شخص کو اپنے بچوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھجوایا تھا اور اس نے تمام حالات معلوم کر کے گورو جی کو اس سانحہ کی خبر دی تھی کہ ان کے دو چھوٹے بچے سرہند میں کام آئے ہیں[۲]۔

اس سلسلہ میں ایک صاحب کا یہ بیان ہے کہ گورو صاحب نے "رائے کلہہ" کے ذریعہ اپنے صاحبزادوں کی خبر منگوائی تھی[۳]۔

یہ متضاد اور مختلف باتیں ہیں اس فرضی قصہ کی تغلیط کر رہی ہیں۔

سرہند میں کام آنے والے گورو جی کے بچے

موجودہ زمانے کے اکثر سکھ ودوانوں کے نزدیک سرہند میں کام آنے والے گورو گوبند سنگھ جی کے بچوں کے نام زور آور سنگھ اور فتح سنگھ تھے[۴] لیکن جب ہم پراچین سکھ کتب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ گورو جی کا بچہ زور آور سنگھ سرہند میں کام نہیں آیا تھا۔ بلکہ وہ چمکور میں آپ کے ساتھ تھا اور وہاں سے ایک سادھو کے لباس میں اپنی جان بچا کر نکل گیا تھا۔ چنانچہ گورو صاحب موصوف کے درباری شاعر سیناپت جی نے زور آور سنگھ کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ۔

پلک پلک کے کٹک کو نکس گیو سو پار ۔ زور آور سنگھ زور کر راکھیو کرتار[۵]

۱؎ گورو نبادلی۔ ص ۱۳۵۔ ۲؎ تواریخ گورو خالصہ ص ۱۲۸۔
۳؎ سکھ پنتھ کیتھے تول کیتھے۔ ص ۱۹ ۴؎ مہان کوش۔ ص ۲۰۴۔ جیون کتھا گورو گوبند سنگھ جی ص ۲۳۲۔ سکھ اتہاس۔ ص ۲۷۴۔ گورومت لیکچر ص ۲۰۴ بہشٹلے اتہاسک ص ۵؎ گورسو بھاگر نتھ ادھیائے ۱۲۔

یعنی زور آور سنگھ لڑتے لڑتے جان بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور خداتعالیٰ نے ان کی حفاظت کی۔ ایک سکھ ودوان رقمطراز ہیں کہ۔

"گورسوبھا کے مصنف نے زور آور سنگھ جی کو چمکور صاحب کی لڑائی میں لڑتے ہوئے صحیح سلامت باہر نکال دیا ہے[۱]"

اور بھی متعدد سکھ ودوانوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سیناپت جی نے صاحبزادے زور آور سنگھ جی کا چمکور کی لڑائی میں شامل ہونا اور پھر اپنی جان بچا کر نکل جانا بیان کیا ہے[۲]

سکھ لٹریچر سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب گورو جی دکن کی طرف جا رہے تھے تو راستہ میں صاحبزادے زور آور سنگھ جی ان سے آملے تھے۔ اور گورو صاحب نے اپنے لڑکے کے اس طرح ملنے پر بہت خوشی منائی تھی۔

اور سکھ ودوانوں نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ گورو صاحب کے صاحبزادے زور آور سنگھ انہیں دکن جاتے ہوئے راستہ میں ملے تھے۔ اور گورو جی نے اس کے اس طرح ملنے پر بہت خوشی منائی تھی[۳]

اس کے بعد گورو صاحب کا یہ بچہ ان کے ساتھ ہی رہا۔ اور چتوڑ میں تاریخی قلعہ دیکھنے کے لئے گیا۔ وہاں مسلمان پہرہ دار سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اور اس جھگڑے میں مع اپنے ساتھیوں کے مارا گیا تھا[۴]

---

[۱] رسالہ گورمت پرکاش امرتسر جنوری ۱۹۶۳ء [۲] جنم ساکھی گورو گوبند سنگھ جی ص ۷۶۳ گور پرتاب سورج گرنتھ سپادت۔ ص ۸۔ و رسالہ کول سنسار امرتسر جنوری ۱۹۶۰ء [۳] گور پرنالیا ص ۱۱۷۔ امرنامہ ص ۱۰۔ رسالہ سنت سپاہی۔ امرتسر جنوری ۱۹۵۴ء [۴] گور بلاس پاتشاہی دس ادھیائے ۱۷۔ انک ۱۹۔ ۱۸۔ ۱۷۔ گور پرنالیاں ص ۱۱۷۔ امرنامہ ص ۱۰۔ رسالہ سنت سپاہی امرتسر جنوری ۱۹۵۴ء۔ تاریخ معظم شاہی منقول از ماخذ تاریخ سکھاں ص ۷۷۔ ۸۱

اس صورت میں ہمارے ان سکھ دوستوں کو جو زورآور سنگھ جی کا صوبیدار سرہند کے حکم سے زندہ دیوار میں چُنا جانا یا قتل کیا جانا تسلیم کرتے ہیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ اگر وہ فی الحقیقت سرہند میں کام آیا تھا اور اس کا یہ قتل اورنگ زیب یا اس کے کسی اہلکار کے ظلم کا نتیجہ تھا تو اس صورت میں وہ گورو گوبند سنگھ جی کے دکن جاتے ہوئے راستہ میں کہاں سے آ گیا تھا۔ گورو صاحب کا یہ سفر خود سکھ ودوانوں کو تسلیم ہے کہ سرہند کے سانحہ کے بعد کا ہے۔

سرہند میں گورو جی کے کتنے بچے کام آئے

سکھ مصنفین اور مورخین عام طور پر یہی بیان کرتے ہیں کہ سرہند میں گورو جی کے دو بچے مارے گئے تھے۔ لیکن جہاں تک حقیقت اور تاریخ کا تعلق ہے گورو صاحب کے دو بچوں کا سرہند میں مارا جانا ثابت نہیں ہے بلکہ ان کا صرف ایک ہی بچہ اپنی دادی کے ساتھ سرہند میں لایا گیا تھا۔ ایک سکھ ودوان کا بیان ہے کہ۔

"سرہند کے فوجدار نواب وزیر خاں کی ایک رپورٹ جو اس نے اورنگ زیب کی خدمت میں ارسال کی تھی بڑی ماتا جی کے ساتھ صرف ایک بچہ فتح سنگھ جی کا سرہند میں پہونچنا ثابت کرتی ہے[1]"

ایک اور مقام پر مرقوم ہے کہ۔

"سرہند کے فوجدار وزیر خاں کی طرف سے کی گئی رپورٹ سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرہند میں صرف ایک ہی صاحبزادہ بابا فتح سنگھ شہید ہوا تھا[2]"

---

[1] انھاسک پتر جلد ا نمبر ۲ ص ۷، حاشیہ۔ گورگنانیاں ص ۱۱۸ [2] رسالہ گورمت پرکاش امرتسر جنوری ۱۹۶۳ء

سکھ ودوانوں کی مندرجہ بالا تحریرات میں سرہند کے فوجدار وزیر خاں کی جس رپورٹ کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"نوشتہ شریف مشتمل بر فرد وآمدن گوبند نانک پرست دوازدہ کروہی بسرہند فرستادن آں اعتضاد جمیعت ہفت سوا با مصالح توپ خانہ ومحصور شدن آں مقہور در حویلی زمیندار موضع چکور وبقتل رسیدن دو پسر ودیگر رفقائے او دستگیر شدن یک پسر ومادرش ودیگر مطالب رسید چوں عرضداشت آں عالیشان بریں مقدمات فروغ اندوز نظر عالم افروز گردیدہ بود ورخصت عوال پناہ مرزا یار علی بیگ مفصل عرض رسانیدہ بود مضمون آں نوشتہ بعرض اشرف رسانید[1]"

سرہند کے فوجدار کی یہ رپورٹ واضح ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ گورو گوبند سنگھ جی کا ایک بچہ سرہند میں لایا گیا تھا۔

سکھوں کی ایک مشہور ومعروف کتاب سو ساکلی ہے۔ مشہور سکھ مورخ بھائی سنتوکھ سنگھ جی نے گور پرتاپ سورج گرنتھ کا وہ حصہ جو گورو گوبند سنگھ جی کے حالات پر مشتمل ہے اسی سو ساکلی کی بنیاد پر ہی تیار کیا ہے[2] نیز نامدھاری فرقہ کے لوگ تو اس کے بہت عقیدتمند ہیں اس سے بھی یہی واضح ہے کہ سرہند میں گورو صاحب کا ایک ہی بچہ کام آیا تھا۔ جیسا کہ مرقوم ہے کہ۔

---

[1] احکام عالمگیری قلمی منقول از ماخذ تاریخ سکھاں ص ۷۰۔ [2] ایک ودوان کا بیان ہے کہ "بھائی سنتوکھ سنگھ جی نے بھی دسم گورو کے متعدد واقعات سو ساکلی میں سے لے کر گورپرتاب سورج گرنتھ میں درج کئے" رسالہ سنت سپاہی دسمبر ۱۹۶۲ء

"گوروجی کا ایک بچہ اپنی دادی کے ساتھ سرہند میں مرا تھا[1]"۔ "گورستِ موآ" واحد کا صیغہ ہے۔ جس سے ایک سے زائد بچے مراد نہیں لئے جا سکتے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ سرہند میں مرنے والا بچہ دیوار میں چنوائے جانے سے یا قتل کئے جانے سے نہیں مرا تھا بلکہ اسکی موت قدرتی طور پر واقع ہوئی تھی۔

سکھوں میں ایسے ودوان **اسکالر** موجود ہیں جو اس امر کے معترف ہیں کہ تاریخ سے یہی ثابت ہے کہ گوروجی کا ایک ہی بچہ سرہند میں لایا گیا تھا۔ جیسا کہ ایک صاحب کا بیان ہے کہ:۔

"ایک قابلِ احترام محنتی ریسرچ سکالر (محقق ودوان) نے آج سے کچھ عرصہ قبل شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی طرف سے شائع ہونے والے ٹریکٹ میں ایک مضمون شائع کرایا تھا اس میں ان کی یہ تحقیق شامل تھی کہ فتح گڑھ صاحب (سرہند) کے مقام پر صرف ایک صاحبزادے کو شہید کیا گیا تھا[2]"۔

جس قابلِ احترام ہستی اور محنتی محقق کا ذکر مندرجہ بالا اقتباس میں کیا گیا ہے وہ بھائی رندھیر سنگھ جی سکھ ہسٹری ریسرچ سکالر شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی ہیں۔ اور ان کا اس بارے میں یہ بیان ہے کہ:۔

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرہند میں صرف بابا فتح سنگھ جی شہید ہوئے تھے[3]"۔

ایک اور مقام پر بھائی صاحب موصوف نے بیان کیا ہے کہ۔

---

[1] سو ساکھی، ساکھی ۵۶ [2] گورست پرکاش امرتسر اگست ۱۹۶۰ء [3] اتہاسک پتر جلد ۱ نمبر ۲۔ ص ۲، حاشیہ۔ گورپرنالیاں ص ۱۱۸ حاشیہ۔

"۳ پوہ (۲۰ دسمبر) اتوار گورو ماتا گوجری جی اور چھوٹے صاجزادے بابا فتح سنگھ جی سرہند میں سچ دھرم پر قربان ہو گئے۔"[1]

ایک اور ودوان رائے چترمان جی نے بھی گورو صاحب کے ایک بچے کا سرہند میں کام آنا بیان کیا ہے۔ جیسا کہ مرقوم ہے۔

"ہر دو پسر گورو گوبند کہ یکے در حوالی سہرند با وزیر خاں فوجدار آنجا جنگ کردہ کشتہ شد و دویے در اجمیر کشتہ شد"[2]

یعنی - گورو گوبند سنگھ جی کا ایک بچہ سرہند میں وزیر خاں سے لڑتا ہوا مارا گیا اور دوسرا اجمیر میں جاں بحق ہوا۔

قطع نظر اس کے کہ صاجزادہ فتح سنگھ جی کی موت قدرتی طور پر ہوئی تھی۔ یا انہیں دیوار میں زندہ چن کر ختم کر دیا گیا۔ یا وہ قتل کر دئے گئے تھے یا لڑتے ہوئے مارے گئے تھے یا ان کا پیٹ چاک کیا گیا تھا۔ ان حوالہ جات سے یہ ثابت ہے کہ سرہند میں گورو جی کے دو بچے کام نہیں آئے تھے بلکہ ایک ہی بچے کی موت واقع ہوئی تھی نیز سرہند میں جو گوردوارہ اس فرضی قصہ کی یاد کے طور پر بنایا گیا ہے اس کا نام فتح گڑھ صاحب ہے جو گورو صاحب کے چھوٹے صاجزادے فتح سنگھ کی یاد پر دلالت کرتا ہے۔ ایک سکھ ودوان نے اس بارے میں بیان کیا ہے کہ۔

"سرہند میں صرف ایک صاجزادے بابا (فتح سنگھ) شہید ہوئے جن کے نام پر یادگاری مقام فتح گڑھ صاحب موجود ہے"[3]

---

[1] رسالہ سنت سپاہی امرتسر جنوری ۱۹۵۶ء۔ [2] چہار گلشن منقول از ماخذ تاریخ سکھاں۔ ص ۸۲

[3] ۔ گورمت پرکاش امرتسر۔ جنوری ۱۹۶۳ء

بھائی رندھیر سنگھ جی ایک مشہور ریسرچ اسکالر ہیں آپ نے سرہند میں گورو جی کے ایک بچے کے مرنے کی توجیہہ بیان کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ سرہند میں جو گوردوارہ اس واقعہ کی یادگار کے طور پر چلا آرہا ہے۔ اس کا نام شروع ہی سے فتح گڑھ صاحب ہے اور یہ گورو صاحب کے چھوٹے بچے فتح سنگھ کے نام پر ہی تعمیر کیا ہے۔ اور اس کی تعمیر بابا بندہ کے زمانہ میں ۱۷۱۰ء میں ہوئی تھی۔[1]

ایک اور سکھ ودوان کے نزدیک گوردوارہ فتح گڑھ صاحب سمت ۱۸۲۱ بکرمی (۱۷۶۴ء) میں بنایا گیا تھا۔[2]

الغرض پراچین سکھ بزرگوں کا سرہند میں گورو صاحب کے چھوٹے بچے فتح سنگھ کے نام پر گوردوارہ فتح گڑھ صاحب تعمیر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی گورو صاحب کا ایک ہی بچہ سرہند میں کام آیا تھا۔ ورنہ یہ ناممکن تھا کہ وہ اس طرح یادگار میں صرف ایک بچہ کا نام شامل کرتے۔ سرہند میں تاریخی گوردوارہ تعمیر کرنے والے سکھوں کے بارے میں یہ کون باور کر سکتا ہے کہ انہیں گورو صاحب کے دوسرے بچے سے کوئی عداوت تھی یا انہیں فتح سنگھ جی سے ہی کوئی خاص لگاؤ یا محبت تھی۔ جبکی وجہ سے انہوں نے اسی کے نام پر یادگار تعمیر کی اور دوسرے بچے کا نام بالکل ہی نظرانداز کر دیا۔

---

[1] اتہاسک پتر جلد ۲ نمبر ۱۔ ص ۲۷، گورنالیاں [2] رسالہ گورمت امرتسر جنوری ۱۹۵۸ء

[3] سکھ پنتھ کتھے توں کتھے ص ۱۷۵ ۔

عالمگیر کی مذہبی رواداری
ہندوؤں کے ساتھ

از نصیب اختر۔ ایم اے

یوں تو غیر مسلموں کے ساتھ رواداری مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور اس سلسلے میں مسلمانوں اور مسلمان فرماں رواؤں نے شریعت کا اتنا پاس و لحاظ رکھا کہ گویا شریعتِ اسلامیہ غیر مسلموں اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک ہی کے لئے آئی ہے۔ تاریخ اسلام کا کوئی دور ایسا نہیں ہے جو اس اعتبار سے ممتاز نہ رہا ہو۔ لیکن شاہانِ مغلیہ کے دور میں خصوصاً اکبر کے عہد سے غیر مسلموں سے ساتھ جس رواداری کا مظاہرہ کیا گیا اس میں انداز دلداری کی جھلک کچھ حد سے سوا ملتی ہے ان کے طرز جہانبانی میں حسن سلوک اس حد تک بڑھا کہ حسن بلاخیز بن گیا نتیجہ یقیناً بعد کے مسلمان فرماں رواؤں کے لئے جرأت آزما نکلنا چاہئے تھا۔ اکبر نے جس سپردگی اور عقیدتمندی کے ساتھ خود کو اپنے ہندو پرستاروں کے سامنے پیش کیا اس سے ظاہر تھا کہ ایک دن نوبت پرستاروں کی بیباکیوں و دست درازیوں تک پہونچے گی۔ چنانچہ جہانگیر کے دور میں ان کی بلند ہمتی صنمخانوں کی تعمیر نو تک پہونچی ابوالفضل کے قتل کے بعد عہد جہانگیری میں اسی مسلمان ذی مرتبہ ہستی کے قاتل نے اسی کی دولت سے بہ الطافِ خسروانہ متھرا میں ایک عظیم الشان بتخانہ کی تعمیر و تزئین کی۔ شاہجہاں اگرچہ اکبر و جہانگیر کے مقابلہ میں اسلام سے قریب تر تھا مگر ہندوؤں کی جرأتوں کو جو تحریک مل چکی تھی اسے آگے ہی بڑھنا تھا

اور وہ اب بھی بے خوف و خطر بڑھی۔ اس وقت تک تو پتھر کے اصنام بتخانوں میں نصب ہوتے تھے مگر اب جیتے جاگتے اجسام یعنی نازک اندام عصمت مآب مسلمان دوشیزائیں ہندوؤں کے سیاہ خانوں میں محبوس ہونے لگیں۔ مسجدوں کے میناروں سے ناقوسوں کی آوازیں نکلنے لگیں اور صحنِ حرم نامحرموں کے مسکن بن گئے۔ شاہجہاں کے درباری مورخ عبدالحمید لاہوری کے الفاظ اس کے شاہد ہیں۔

"برخے از کفار نابکار حرائر و آمائے مومنہ در تصرف دارند
و چندے از بینال مساجد بہ تعدی در عمارات خود آوردہ"[۱]

شاہجہاں نے ہندوؤں کی دن بدن بڑھتی ہوئی ان جرأتوں کو روکا اور بلا شبہ تادیب سے کام لیا عبدالحمید اسی واقعہ کے ذیل میں لکھتا ہے۔

"تا بعد از ثبوت نساء مسلم را از تصرفِ کفار برآوردہ و مساجد و عمارات
آں ملاعین جدا سازد۔ او مطابق حکم بہ عمل آوردہ.... ہر جا کہ
مسجدے در زیر عمارت ہنود در آمدہ بعد از تحقیق آں را افراز نمودہ
قدرے ازانجا بطریق جرمانہ گرفتہ بدستورِ سابق مسجد
ساخت"[۲]

نہ صرف یہ بلکہ بنارس کے جدید تعمیر شدہ بت خانے بھی گروائے[۳]۔ لیکن شاہجہاں کی ہر تنبیہ ہندوؤں کی نظر میں ایک اندازِ محبوبانہ سے زیادہ نہ تھی۔ اورنگ زیب کے نام ایک دھمکی آمیز خط میں شیواجی جیسا بدترین مغل دشمن اسی شانِ محبوبی کا قصیدہ پڑھتا ہے۔ لکھتا ہے
"شاہجہاں نے اس دنیا کو ۳۲ سال اپنے سایۂ عاطفت سے

---

[۱] شبلی "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر"، ص ۶۰ بحوالہ شاہجہاں نامہ جلد دوم ص ۵۷۔ [۲] شبلی ص ۶۰ بحوالہ شاہجہاں نامہ ص ۵۸-۵۷ [۳] شبلی ص ۶۱

نوازا اور بقائے دوام حاصل کیا........ وہ جو اچھے نام سے یاد
کیا جاتا ہے دولتِ دوام حاصل کرتا ہے۔ کیوں کہ اُس کی موت
کے بعد اس کے اچھے کاموں کی یاد اس کے نام کو ہمیشہ
زندہ رکھتی ہے۔[۱]"

لیکن شاہجہاں کے جانشین اورنگ زیب نے جب ہندوؤں کی جراءتِ بیجا پر اسی قسم کی تادیب و تنبیہ سے کام لیا تو بے محابا بدنام ہوا۔ حالانکہ وہ سابقین کے مقابلہ میں محض سیاسی رواداری نہ تھا۔ بلکہ خالصاً اور فطرتاً بھی اس حد تک رواداری برتتا تھا کہ اس کی سادہ لوحی پر حیرت ہوتی ہے اس کی مثالیں آئندہ سطور میں واضح طور پر سامنے آئیں گی۔ مگر افسوس وہی متعصب و تنگ نظر سمجھا گیا۔ وہی مصلح مجرم قرار پایا جس نے نہ صرف اپنی ذات، اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کی حالتِ دگرگوں کو سنبھالا۔ بلکہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو جو مذہب سے ہٹ کر بے راہ روی اور بداعمالیوں کے مرتکب ہو رہے تھے عام انسانی اخلاقیات کے تحت انسانی سطح پر لانے کا کوشاں ہوا۔

دراصل اورنگ زیب ایسے متشرع فرمانروا کی مذہبی رواداری کو جس معیار سے جانچا اور پرکھا گیا وہ سابقین سے زیادہ اس کے حریف سلطنت داراشکوہ کا متضاد کردار تھا جس کے حسنِ کرشمہ ساز نے اپنشد کو قرآن اور قرآن کو اپنشد بنا دیا تھا۔ جس کے چند روزہ دورِ اختیار میں جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں جس کا جنوں اس حد تک بڑھا کہ رام چندر ثانی بننے کے خواب دکھائی دینے لگے۔[۲] جس کی مجتہد

---

[۱] سرکار جلد سوم ضمیمہ ۶ ص ۵۰۔۱۰۷ اس خط کے راقم کے متعلق شبہ ہے۔ سرکار اسے شیواجی کا قرار دیتے ہیں۔ راج سنگھ، جسونت سنگھ یا شمبھوجی کے راقم ہونے کا بھی شبہ ہے تاہم انہیں سے ہر ایک مسلمانوں کا سخت ترین دشمن تھا۔ [۲] مقالہ بعنوان "Religeoues Issue in Mughal war of success-ion" 1657-58 از ڈاکٹر افتخار احمد غوری جو حالیہ ہسٹری کانفرنس میں پڑھا گیا۔

برہمنوں اور گوسائیوں سے گرم رہتی تھیں[1]۔ جس کے مشرب میں اونچا پائجامہ پہننے والے مضحکہ خیز تھے[2]۔ حتیٰ کہ جس کے ہاتھ میں بطور نشانی ایک ایسی انگشتری بھی تھی جس پر بجا ہندی "پر دھو" کندہ تھا[3]۔ اسی کے طلسم ہوشربا نے جانشینی کی جنگ کے شعلوں کو تیز سے تیز تر کیا۔ اگرچہ اس جنگ کا فیصلہ اورنگ زیب کے حق میں ہوا۔ بظاہر آگ دب گئی مگر بعض ہندوؤں کے سینے سلگتے رہے، چنگاریاں نکلتی رہیں۔ اور اورنگ زیب کے دامن کو داغدار بنانے کی کوشش میں ہمیشہ مصروف رہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاج وتخت حاصل کرنا شہزادہ کا مقصد اولین تھا مگر اس مقصد کے حصول کے لئے ہتھیاروں کی جھنکار کے ساتھ ساتھ دو نظریات، دو مذاہب اور دو قومیں ٹکرائیں، ایک طرف ہند کے تمام نامور ہندو سردار تھے اور دوسری جانب صرف مسلمان شہسوار۔ اور ان میں سے بھی بعض شاہجہاں کے پاس و لحاظ کی وجہ سے بالاعلان اورنگ زیب کا ساتھ نہ دے سکے۔ مگر شائستہ خاں جیسے امراء بہ خلوص نیت، لیکن پس پردہ اورنگ زیب کے بہی خواہ تھے۔ دوسری طرف راٹھور راؤ کرن جیسے اورنگ زیب کے ساتھ بیجاپور کی اہم مہم پر تھے جو داراشکوہ کے اشارہ پر بلا اجازت اور مہم کی اہمیت کو پس پشت ڈال کر مرکز کی طرف واپس چلدئے۔ مرکز میں اس نظریاتی اجتماع کے پیش نظر اورنگ زیب کو بھی اپنے ہمراہیوں میں سے مسلمان امراء کو مذہب کی بنیادوں پر ہی روکنا پڑا۔ بیس مسلمان کرار دالیسی کے حکم کو نظر انداز کر کے اورنگ زیب کی درخواست پر اس کے ساتھ ہو گئے[4]۔

پھر اورنگ زیب کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے راجگان ہند میں بھر برآوردہ مہاراجہ

---

[1] خافی خاں۔ ص ۲۳ اردو ترجمہ [2] ڈاکٹر غوری بحوالہ عاقل خاں رازی ص ۱۰ [3] حسب نوٹ نمبر ۲ [4] ڈاکٹر غوری بحوالہ تاریخ شاہجہاں از محمد صادق (ایک نادر نسخہ)

جسونت سنگھ کا انتخاب کیا گیا۔ جو بقول عاقل خاں رازی۔

"بہ اشارہ شہزادہ کلاں (داراشکوہ)، بہ ایذا د آزار ایں
خیرخواہ مامور بود، لبسلہ ضبابانی، جہل وجوانی وناوانی سنگ راہ
گشت۔ بقدم ممانعت پیش آمد؎"

قاسم خاں کو بھی ایک علیحدہ جمعیت کے ساتھ جسونت سنگھ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ تاکہ
"مرادبخش بنابر جہل وجوانی وغرور ونادانی سرازدائرہ
اطاعت بیرون بردہ از امتثال حکم واجب الاتباع سر زند
یا قدم جرأت وجسارت پیشتر نہادہ ارادہ ایں صوب نماید
بممانعت ادبپردازد۔ بلکہ از ولایت گجرات بدرساختہ براہ دکن
اندازد۔؎"

لیکن ہمعصر مورخین کے یہاں اس سلسلہ میں اس کا کوئی نمایاں کردار نظر نہیں آتا بلکہ وہ مشتبہ
دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک مالوہ میں عضو معطل کی طرح پڑا رہتا ہے اور بقول خافی خاں
مراد کا راستہ روکنے کے لئے نکلا بھی تو اس وقت جب کہ وہ چکر کاٹ کر اورنگ زیب سے
مل جاتا ہے۔ قاسم خاں ناکام واپس آجاتا ہے۔ اس کے متعلق تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ
جسونت سنگھ کی شکست اسی کی پہلوتہی کے سبب ہوئی۔

سموگڈھ کے فیصلہ کن میدان میں بھی زیادہ تر ہندو ہی پیش پیش اور داد شجاعت
دیتے نظر آتے ہیں۔

"راجہ رام سنگھ جس کی بہادری کی راجپوتوں میں بڑی شہرت
تھی..... اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنی دلیری کی ڈینگیں مارتا

؎ واقعات عالمگیری ص ۴۰ ؎ واقعات عالمگیری از عاقل خاں رازی ص ۲۲

ہو احمد مراد بخش کی سواری کے قریب پہونچتا ہے اور گستاخی و
بے باکی سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے۔ تو دارا شکوہ کے مقابلہ پر
بادشاہی کی ہوس کر رہا ہے[۱]۔"

راجہ کے اس جملہ میں جس کو لین پول نے میڈیول انڈیا کے صفحہ ۲۴۰ پر بڑے زور شور سے نقل کیا ہے جنگ کی تمام سمیت اور اس تعصب و تنفر کا اظہار ہے جس کے لئے یہ جنگ لڑی گئی تھی۔

مگر اسی جنگ نے اس کی بے مثل رواداری کا ثبوت فراہم کیا اسی کی مسموم و متعصب فضا، میں اورنگ زیب کی بے تعصبی، فراخ دلی، عالی حوصلگی اور بلا تخصیص مذہب قدر شناسی کا ایک واقعہ یادگار ہے۔ تنگ نظر لاکھ اسے نظر انداز کر جائیں مگر تاریخ کے ان صفحات سے نظر ٹھہرے بغیر نہیں گذر سکتی جہاں خافی خاں رقمطراز ہے کہ

"راجہ روپ سنگھ راٹھوڑ جوش بہادری میں گھوڑے
سے پیادہ ہو گیا اور ہتھیلی پر جان رکھ کر برہنہ شمشیر لہراتا ہوا
قلب لشکر کی صفوں کو چیرتا ہوا اورنگ زیب کی سواری کے ہاتھی
کے قریب پہنچ گیا اور عماری کی رسیوں کو کاٹنے کے لئے وار کیا۔
اورنگ زیب اس کی دلیری اور بہادری کو دیکھ کر ازراہِ
انصاف و قدردانی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مارا جائے اس نے
حکم دیا کہ اس کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرو[۲]۔"

رواداری سے عاری میدان کارزار میں ایک ایسے دشمن کو جان کی امان کا فرمان

---

[۱] خافی خاں۔ ص ۳۴۔ نیز ملاحظہ ہو لین پول۔ میڈیول انڈیا جلد دوم ص ۲۴۰

[۲] خافی خاں۔ ص ۴۴۔

جو جان لینے کے لئے پہل کر چکا ہو اور اس مذہب سے تعلق رکھتا ہو جس کے بل بوتے پر جنگ لڑی جا رہی ہو حیرت و استعجاب میں ڈال دیتا ہے۔ مگر سرکار جیسے مورخین نگاہ بچا کر نکل جاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اس کی فطری اور غیر سیاسی بے تعصبی اور رواداری کی بین دلیل تھی۔

مگر کس کس بات سے نظر بچا کر نکلیں گے۔ اس جنگ کے شرکا کے لئے معافی و تلافی، عفو و درگذر، انعام و اکرام کی بارش، اعزاز و خطابات کی فیاضانہ پیش کش اور کیا کیا نہ کیا گیا۔ اس کے برعکس ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے اورنگ زیب کا ہندوؤں سے مذہبی انتقام خصوصاً ایسی جنگ کے بعد جو مذہبی بنیادوں پر ہو ثابت ہوتا ہو اس ضمن ہندو شرکاء جنگ یا عام ہندوؤں پر اس کا عتاب ثابت ہوتا ہو۔

دارا شکوہ کی بھڑکائی ہوئی تعصب کی آگ کو سرکار نے "ہندوؤں کے نشاۃ الثانیہ"[1] کی علامت قرار دیا ہے! مگر موصوف کی یہ عہد عالمگیری میں اورنگ زیب کی مذہبی تنگ نظری کے خلاف بھڑکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس سے قبل ہی شعلۂ جوالہ بن چکی تھی۔ ہندوؤں کی ہوا و ہوس پر دارا شکوہ کے ہندو دھرم کی جانب حد سے زیادہ میلان طبع اور ہوس تاج و تخت نے "آگ پر تیل" کا کام کیا تھا۔ اگرچہ دارا شکوہ اور اس کے ہندو حاشیہ بردار خود اپنی آگ میں جل گئے۔ شعلے بھڑک کر خاموش ہو گئے۔ مگر ایک سوزش تھی جو باقی رہی۔ اور کبھی کبھی ہندوؤں کو بیقرار کرتی رہی۔

اس سوزش و جلن کو مٹانے کے لئے مہاراجہ جسونت سنگھ نے جو جو جتن کئے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ دھرمات کے مقام پر "سنگ راہ" بننے کی غلطی کو اورنگ زیب اپنی کشادہ دلی کی وجہ سے نہ صرف معاف کر چکا تھا بلکہ اسے اعزاز و مراتب سے نواز چکا تھا مگر شجاع کے

---

[1] ہسٹری آف اورنگ زیب جلد سوم ص ۴-۳ ملاحظہ کیجئے۔

مقابلہ پر عین میدانِ جنگ میں اپنے محسن سے کھلم کھلا غداری اسی آتشِ سوزاں و پنہاں کا نتیجہ تھی

مرہٹوں کے خلاف دکن کی اہم مہم ایک بار اسی کی وجہ سے ناکام ہوئی تھی۔ اسی مہم میں بقول جیمس گرانٹ ڈف "یہ پہلا موقع تھا کہ مرہٹے مغل سواروں کا تعاقب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں[۱]"۔ اسی مہم کے سربراہ شائستہ خاں نے اورنگ زیب کو لکھا تھا کہ "جسونت سنگھ شیواجی کے ہاتھوں خریدا جا چکا ہے[۲]۔" اگرچہ اورنگ زیب نے شائستہ خاں کی اس اطلاع پر جسونت سنگھ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ بلکہ شائستہ خاں کو واپس بلا کر بنگال کی صوبہ داری پر بھیجدیا۔ اور اسے اسی مہم پر نائب کی حیثیت سے رہنے دیا۔ تاکہ راجہ کا دل میلا نہ ہو۔ ورنہ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے کچھ عرصہ بعد جسونت سنگھ کو کابل کی مہمات پر متعین کر دیا تاکہ وہاں نہ ہندو ہوں گے اور نہ بے جا ہندو نوازی۔ اور آخر کار وہ وہیں ۱۰ دسمبر ۱۶۷۸ء کو تقریباً ۲۰ سال اورنگ زیب کی قوتِ صبر و تحمل اور اس کے جذبۂ رواداری کو سخت آزمائشوں میں مبتلا کر کے فوت ہوا۔ اورنگ زیب کی یہ عالی ظرفی اور ہندو رعایا کی پاسداری تھی کہ اس نے ہندوؤں کے اس قابلِ صد احترام مہاراجہ کو جو "راجگانِ ہند میں بلند پایہ رکھتا تھا[۳]" کوئی سزا نہیں دی۔ ورنہ دھرمات کے اس شکست خوردہ اور مغرور کو جس نے مسجدوں کو ڈھا کر ان کی جگہ مندر بھی تعمیر کرائے تھے[۴]۔ عبرتناک سزا دینا اورنگ زیب کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

اس کے برعکس اور ان تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود اورنگ زیب نے نہ صرف جسونت سنگھ بلکہ عام راجپوت راجاؤں کا بھی ہر ممکن طور پر دل رکھا۔ اعزاز و مراتب کے علاوہ دیرینہ تعلقات و قرابت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید رشتہ داریاں بھی قائم کیں ان میں

---

۱ و ۲ ہسٹری آف دی مرہٹہ۔ از جیمس گرانٹ ڈف جلد اوّل ص ۱۶۶ ۳ مآثر عالمگیری ص ۱۲ اردو ترجمہ ۴ ہسٹری آف اورنگ زیب جلد سوم حاشیہ ص ۳۲۵

اپنے بیٹوں کے بیاہ کئے۔ تالیف قلب کا ایک واقعہ مستعد خاں ساقی نے بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے

"زمانہ قدیم سے یہ دستور تھا کہ فرمانروا اپنے ہاتھوں سے عالی مرتبہ راجاؤں کی پیشانی پر قشقہ کھینچتے تھے عہد معدلت عالمگیری میں راجہ اندر سنگھ کی پیشانی پر اسد خاں نے بموجب حکم قشقہ کھینچا[1]۔"

اگرچہ بعد کو اورنگ زیب نے اس کو ترک کر کے صرف تسلیم ہی کو کافی سمجھا مگر اس واقعہ کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ جزیہ کے اعلان کے بعد کا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ کا اعلان ہندو دشمنی پر مبنی نہیں تھا۔ ورنہ وہ اس ہندوانہ رسم کو اپنے حکم سے ادا نہ کراتا۔ جلوس کے اڑتیسویں[38] سال عام راجپوتوں کو ایک خصوصی امتیاز بخشا۔ بقول مستعد خاں ساقی۔

"دربار عالی اور نیز صوبہ جات میں اعلان ہوا کہ سوائے فرقہ راجپوت کے دیگر اقوام ہندو ہتھیار نہ لگائیں، عراقی وعربی گھوڑے، اور پالکی پر سوار نہ ہوں[2]۔"

یہ اعلان تمام ہندوؤں سے ناانصافی پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ خود ہندو سماج میں اس قسم کی تفریق پہلے سے موجود تھی۔

اورنگ زیب کے حسن سلوک اور رواداری ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ جنگ جانشینی میں داراشکوہ کے ہوا خواہ اورنگ زیب کے بہی خواہ نظر آتے ہیں۔ گرانٹ ڈف لکھتا ہے۔

"مرزا جے سنگھ اور دلیر خاں دونوں اس سے قبل داراشکوہ کی حمایت کا اعلان کر چکے تھے مگر اورنگ زیب نے

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۱۲۰ [2] مآثر عالمگیری ص ۲۴۷

ان کے دل آخر کار جیت ہی لئے۔ اور انہوں نے اس کے لئے

اہم خدمات انجام دیں؎۱"

بلکہ وفاداری اور جاں نثاری کے نمایاں ثبوت بہم پہونچائے دکن کی پرخطر، اہم اور طویل مہم میں بیجاپوری افواج اور مرہٹوں سے لڑ کر کار ہائے نمایاں انجام دئے۔ جے سنگھ ہی کا کام تھا کہ اس نے شیواجی اور اس کے ساتھیوں کو پے در پے تباہ کن شکستیں دیں اور ایک سخت محاصرہ کے بعد شیواجی کے سر پر غرور کو ایک بار آستانہ شاہی پر بصد نیاز جھکنے پر مجبور کر دیا۔

مرہٹے جے سنگھ کے ہم مذہب ہندو تھے۔ جے سنگھ ایک راجپوت مہاراجہ اور دربار عالمگیری کا ایک بہت بڑا ہندو امیر تھا اگر مرہٹے مذہب کی خاطر لڑتے یا اورنگ زیب مذہبی تعصب کی بناء پر جنگ لڑ رہا ہوتا تو جے سنگھ اور اس کے ہمراہی رائے سنگھ، سجان سنگھ اور دیگر ہندو راجپوت اس جانبازی سے مرہٹوں کی سرکوبی نہ کرتے بلکہ متعصب مہاراجہ جسونت سنگھ کی طرح در پردہ دن بدن بڑھتی ہوئی اس ہندو مرہٹہ طاقت کے ہاتھ مضبوط کرتے۔ لیکن مرہٹوں کی حیثیت محض لٹیروں جیسی تھی انہیں مذہب سے نہیں بلکہ ملک و مال سے غرض تھی۔ ان کی دست درازیاں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر یکساں تھیں مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں راجپوت راجاؤں پر جو ظلم و ستم مرہٹوں نے ڈھائے ان کی تفصیلات خود اورنگ زیب کے سخت ترین مخالف مورخ جادو ناتھ سرکار نے "فال آف دی مغل ایمپائر" میں دی ہیں ان کی درندگی اور بلا تخصیص مذہب غارت گری سے وہ بھی متنفر نظر آتا ہے۔

تاہم اورنگ زیب نے مرہٹوں کے ساتھ بھی ہر ممکن طور پر بہتر سلوک کرنا چاہا مگر

؎۱ ہسٹری آف دی مرہٹہ جلد اول ص ۱۷۱

وہ اس سے دور جنگلوں اور غاروں میں بھاگتے رہے۔ لیکن جب کبھی وہ اس کے حضور پہنچ
اس نے فراخدلی اور مراہم خسروانہ سے کام لیا۔ شیواجی اور ساہو کے ساتھ جو کچھ کیا
وہ انکی حیثیت کے مطابق بلکہ اس سے بھی سوا تھا۔ شیواجی نے اپنی غلط توقعات کو پورا
ہوتے نہ دیکھا تو راہ فرار اختیار کی۔ سنبھا کو بھی پنج ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ مگر وہ
شقی القلب، ظالم و نادان تھا اسے اس کی سزا ملی۔ بہرحال شیوا اور سنبھا نے اورنگ
زیب کے الطاف و اکرام کو ٹھکرا دیا یہ انکا فعل تھا اورنگ زیب نے اپنی جانب سے حسن
سلوک برتنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ شیواجی نے بھرے دربار میں گستاخی کی مگر جے سنگھ
کے کہنے پر اس پر سے سخت نگرانی کا حکم اٹھا لیا۔ حالاں کہ ایک مطلق العنان بادشاہ
کے حضور میں ایک بڑے [illegible] کی معمولی سی گستاخی کی سزا سر قلم کر دینے کے
علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔

اسی گستاخ شیوا کے پوتے اور شقی القلب سنبھا کے بیٹے کے ساتھ جس
لطف و کرم کا برتاؤ کیا گیا اس کے متعلق شبلی ہی کے الفاظ موزوں ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"سنبھا کے ساتھ اس کا بیٹا ساہو اور اس کی ماں بھی
گرفتار ہوئی تھی۔ عالمگیر نے اس موقع پر ایسی فیاض دلی اور
وسعتِ حوصلہ سے کام لیا جس کی نظیر تاریخوں میں بہت کم
ملتی ہے۔ اس نے ساہو کو جو سات آٹھ برس کا لڑکا تھا
ہفت ہزاری کا منصب اور راجہ کا خطاب دیا اور اس کی
سرکار قایم کر کے دیوان اور بخشی مقرر کئے اور حکم دیا کہ اس کا
خیمہ ہمیشہ شاہی خیمے کے ساتھ ایستادہ کیا جائے اس کے چھوٹے
بھائیوں یعنی مدن سنگھ اور مادھو سنگھ کی بھی اسی طرح قدر
افزائی کی۔ بے شبہ یہ بڑی فیاضی کا کام تھا۔ لیکن دور اندیشی

سے دور تھا۔ خافی خاں نے سچ لکھا کہ یہ "افعی کشتن و بچہ اش رانگہ داشتن" تھا۔[۱]

شبلی اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ۔

"اگر تعصب اسی کا نام ہے تو ہزار بے تعصبیاں اس پر نثار کر دینا چاہییں۔ عالمگیر کا برتاؤ آخر تک ساہو کے ساتھ مربیانہ اور فیاضانہ رہا۔ چنانچہ عالمگیر کے مرنے کے بعد ساہو نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔ لیکن عالمگیر کے احسانوں کا پھر بھی اتنا پاس تھا کہ سب سے پہلے اس نے عالمگیر کی قبر کی زیارت کی۔"[۲]

مگر اس کوتاہ نظری کا کیا کیا جائے کہ بحرِ کرم کی اتھاہ گہرائیوں سے آب دار موتیوں کے بجائے سنگریزے چنے جائیں اور پھر تہی دامنی کے ساتھ ساتھ تردامنی کا الزام بھی عائد کر دیا جائے۔

بہر حال وہ مرہٹہ سردار جو قتل و غارتگری کو ترک کرکے اورنگ زیب کے دامن سے وابستہ ہوئے اعزاز و مناصب کے مستحق قرار پائے۔ لیکن جو اس کی رعایا پر جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے ظلم و ستم سے باز نہ آئے۔ ان کی سرکوبی اورنگ زیب اپنے آخری سانس تک کرتا رہا۔ رعایا کے جان و مال کا تحفظ اس کا فرض تھا۔ اس فرض کی ادائگی میں جس کے لئے وہ دونوں جہان میں جواب دہ تھا اس نے اپنے ہی جان و مال کو دکن کی قربان گاہ پر چڑھا دیا۔

ان بڑی بڑی منظم اور سیاسی سازشوں اور سرکشیوں کے علاوہ بعض چھوٹے اور

---

[۱] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۴۰-۳۹

[۲] " " ص ۴۰ آخری جملہ بحوالہ آثر الامرا جلد دوم ص ۳۵۱۔

غیر معروف فرقوں نے بھی علمِ بغاوت بلند کیا۔ مگر ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اورنگ زیب کے مذہبی تشدد کے سبب رونما ہوئے غلط ہے۔ ست نامی فرقہ کی ہنگامہ آرائی جس کے سبب۔

"اطراف کے زینداروں اور بعض کم حوصلہ راجپوتوں نے بھی سرکشی اختیار کر لی تھی۔[۱]"

ایک معمولی سے واقعہ سے شروع ہوئی جس میں اورنگ زیب کی جانب سے مذہبی یا غیر مذہبی کوئی تحریک نہ تھی نہ یہ جھگڑا خالصاً مذہبی بنیاد پر ہوا۔ قصبہ نارنول کے ایک ست نامی کسان اور خرمن مامور ایک سرکاری پیادہ کی باہمی سخت گفتگو اور مارپیٹ نے بقول مستعد خاں ساقی۔ "مہابھارت کی یاد تازہ کر دی تھی[۲]۔ اور سرکار کے اعتراف کے بموجب انہوں نے نارنول کو لوٹا اور مسجدوں کو تباہ کیا۔ اور کسانوں سے مالگزاری خود وصول کرنے لگے۔[۳]" اس بغاوت کو کچلنے میں ہندو راجپوت راجہ بھی شامل تھے۔ خافی خاں لکھتا ہے۔

آخر کار راجہ بشن سنگھ اور حامد خاں و مرتضیٰ خاں نے اور دوسرے امراءِ شاہی نے ان پر حملہ کر کے بڑی دلیرانہ جنگ کی اور ہزاروں ست نامیوں کو کاٹ کر پھینک دیا باقی جان بچا کر بھاگ نکلے۔ اور یہ شورش پوری طرح ختم کر دی گئی۔[۴]"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جھگڑے کی نوعیت خالصاً مذہبی نہیں تھی بلکہ ہندوؤں کے لئے یہ فرقہ ہی قابلِ نفرت تھا۔ سرکار ایشور داس ناگر کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ۔

"ان کی حکومتوں میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تمیز و تفریق نہیں۔ یہ سور اور دوسرے ناپاک جانور کھاتے ہیں۔[۵]"

---

[۱] خافی خاں ص ۲۳۴ [۲] مآثر عالمگیری ص ۸۰-۷۹، [۳] سرکار جلد سوم ص ۲۹۸ -
[۴] خافی خاں ص ۲۳۴ [۵] سرکار جلد سوم ص ۹۷-۲۹۶ - خافی نے ان کی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آگرہ اور متھرا کے ہندو کاشتکار جاٹوں کی سرکشی کی بنیاد بھی مذہبی قرار نہیں دیجا سکتی۔ سرکار نے خود اس کی وجہ بیان کر دی ہے لکھتا ہے۔

"ہندوستانی کاشتکار، خصوصاً آگرہ، متھرا اور اودھ کے کسان مسلمان فرمانرواؤں کے دورِ حکومت میں محصولات کی ادائیگی میں بد معاملہ تھے اور وصولیابی میں اکثر طاقت استعمال کیجاتی تھی"[۱]

اگر اورنگ زیب نے طاقت استعمال کی تو وہی ملزم کیوں قرار دیا جائے اور اس پر خواہ مخواہ مذہبی رنگ کیوں پڑھایا جائے۔ اصل وجہ کو تعصب کی عینک سے دیکھنا غلط ہے۔ جسونت سنگھ کی موت پر جودھپور اور اودے پور کے راجپوتوں نے جو ہنگامہ بپا کیا اس کی ذمہ داری بھی اورنگ زیب پر عائد نہیں ہوتی۔ جسونت لاولد مرا تھا اس کے علاقے کے نظم و نسق کی ذمہ داری بادشاہ پر تھی اس لئے اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کی ریاست انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ جسونت سنگھ کی رانیوں کے دو فرزند پیدا ہوئے ہیں۔ اورنگ زیب پہلے تو اس امر کو مشتبہ سمجھتا رہا مگر تصدیق ہونے پر اس نے جسونت سنگھ کے متعلقین کو یقین دلایا کہ وہ بچوں کے بالغ ہونے پر انہیں منصب و راج عطا فرمائے گا۔"[۲] مگر متعلقین نے اصرار و بے اعتباری سے کام لیا۔ اس درمیان میں ایک بچہ فوت ہو گیا دوسرے کو وہ نہایت عیاری سے نکال کرلے گئے اور آمادۂ فساد ہو گئے۔ اودے پور کے رانا نے ان کا ساتھ دیا۔ اس عیاری اور مکاری پر اورنگ زیب کو جتنا بھی غصہ آتا کم تھا۔ دراصل یہ قضیہ غلط فہمیوں پر

(بقیہ نوٹ ۵ صفحہ پچھلا) جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ ایشور داس کی بیان کردہ ست نامیوں کی عادات کے علاوہ ہیں اسلئے ان عادات کی تردید خافی خاں کے بیان سے نہیں کیجا سکتی سرکار نے خافی خاں کا بیان نقل کر کے اس کی تردید کرنا چاہی ہے۔ [۱] سرکار جلد سوم ص ۲۹۰ [۲] مآثر عالمگیری ص ۱۲۱۔

بنی تھا اجیت سنگھ کے اصلی اور صلبی فرزند ہونے میں جاتی اور خافی متفق الرائے ہیں مگر کچھ عرصہ اشتباہ پر دونوں متفق ہیں۔ اورنگ زیب کے متعدد خطوط میں بھی جبکی ابیت ہی تحریر ہے[۱]۔ بہر طور اس معاملہ کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ حق وراثت سے ہے۔ اجیت جعلی فرزند ہو یا اصلی اورنگ زیب کو اس کی شیرخواری اور نابالغی کی بنا پر اس کا ولی بننے کا حق تھا۔ جسونت کے متعلقین ناقابلِ اعتبار تھے

حقیقتاً ان واقعات کا تعلق مذہب سے نہیں تھا ہر دور میں اس قسم کے واقعات پیش آتے رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ خود ہندوؤں نے بعض واقعات کو مذہبی رنگ دے لیا۔ محض اس لئے کہ اس کے عہد سلطنت میں وہ بے جا ہندو نوازی نہ کی جاسکی جس کی مثال داراشکوہ نے پیش کی تھی۔ یا جو داراشکوہ سے متوقع تھی صرف اس بات سے فائدہ اٹھا کر کہ وہ خود متشرع اور اپنے مذہب پر صرف اپنے اور اپنے ہم مذہبوں کے لئے پابندی سے عمل کرتا تھا۔ واقعی وہ راسخ العقیدہ تھا مگر دوسروں کی مذہبی آزادی میں سدِّراہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ان ہندوانہ رسومات کو جن میں مذہب سے ہٹ کر بداخلاقی بدکرداری اور انسان دشمنی نے راہ پائی تھی مٹانے کی کوشش کی، یہ اس کی اخلاقی جراُت تھی۔ اصلاحی کوشش تھی۔ ستی کی رسم جس سے عیسائیوں تک کو وحشت ہوتی تھی ہندوؤں کے یہاں انسانی تقدس اور تشدد دیر پر مبنی تھی، ہندوستان کے دیگر مسلمان بادشاہوں کی طرح اورنگ زیب نے بھی اس رسم کے قطعی امتناع کا حکم نہیں دیا مگر فوجداروں اور

---

[۱] سرکار جلد سوم ضمیمہ ہ، ص ۱۱۵ سرکار نے خافی خاں کے بیان کے مطابق اجیت کو جسونت کا اصلی فرزند قرار دیا ہے۔ ساقی نے محمدی راج کو صلبی فرزند بتایا ہے جبکی پرورش شاہی محل میں زیب النساء نے کی۔ بہر حال وارث کے خوردسال اور نابالغ ہونیکی وجہ سے حکومت وقت کا فرض تھا کہ وہ اس کی ریاست کی دیکھ بھال کرے۔

صوبیداروں کو یہ علم تھا کہ ستی پر آمادہ ہونے والی عورت اور اس کے اعزا کو سمجھا بجھا کر اس قبیح اور انسانیت سوز فعل سے باز رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی جائے فرانیسی سیاح ڈاکٹر برنیر اپنے بارہ سالہ روزنامچہ (۱۶۵۶ء - ۱۶۶۸ء) میں لکھتا ہے کہ

"آج کل پہلے کی بہ نسبت ستی کی تعداد کم ہو گئی ہے کیوں کہ مسلمان جو اس ملک کے فرمانروا ہیں، اس وحشیانہ رسم کو نیست و نابود کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ اور اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر نہیں ہوا ہے کیونکہ ان کی پالیسی کا یہ ایک جزو ہے کہ ہندؤوں کی رسومات میں دست اندازی کرنا مناسب نہیں بلکہ مذہبی رسوم بجا لانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں۔ تاہم ستی کی رسم کو بعض رکاوٹیں پیدا کر کے روکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی عورت اپنے صوبہ کے حاکم کی اجازت کے بغیر ستی نہیں ہو سکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک کہ قطعی طور پر اس امر کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ اپنے ارادے سے ہرگز باز نہیں آئے گی۔ کبھی تو ایسا کرتا ہے کہ محل سرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں۔[1]"

مگر اس چشم پوشی کو کیا کیا جائے کہ لارڈ ولیم بنٹینک اور راجہ رام موہن رائے کے احسانات کو سراہا جا سکتا ہے مگر مسلمان بادشاہوں خصوصاً اورنگ زیب کی

---

[1] شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب ص ۱۹۹ (اردو ترجمہ)

کوششوں کا تذکرہ بھی گوارا نہیں بلکہ اس کے تعصب پر محمول کیا جاتا ہے۔

بعض مندروں کی تباہی کے سلسلہ میں ایک اور بات کا بھی پتہ چلتا ہے افسوس مسلمان مورخین نے اپنے مذہبی جوش میں منہدم مندروں کی تعداد بڑے جوش وخروش سے مبالغہ آمیز حد تک لکھدی اور اصل وجوہ کو نظرانداز کرکے اس قسم کی ہر ایک بات کو بادشاہِ وقت کے مذہبی جوش پر محمول کیا۔ لیکن بعض حقائق کا پتہ معمولی واقعات اور آثار وقرائن سے بھی چلتا ہے اورنگ زیب کے دور تک نہ صرف اسلامی معاشرہ بگڑ چکا تھا بلکہ ہندو معاشرہ بھی گھناؤنا ہوگیا تھا۔ ان کے منادر ومقدس مقامات طرح طرح کی عیاشیوں کے مرکز بن گئے تھے۔ اورنگ زیب نے مسلمانوں کی بے راہ روی کا روکنے کے لئے محتسب مقرر کئے اور سختی سے احتساب کا حکم دیا۔ لیکن مسلمان بادشاہ ہندوؤں کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن جب کوئی بدکرداری ذاتی مشاہدہ میں آئے تو اورنگ زیب جیسا بادشاہ اس کو گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ اورنگ زیب کو تخت نشینی سے قبل پیش آیا جس کو سرکار نے " اورنگ زیب کا مندروں کو منہدم کرنا " کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ اورنگ زیب نے اپنے ایک خط میں بیدار بخت کو لکھا تھا

" اورنگ آباد کے قریب موضع ستارہ میری شکارگاہ تھی یہاں ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک مندر تھا جسمیں کھانڈے رائے کی شبیہ تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس کو مسمار کردیا اور مندر کی رقاصاؤں (مرہیوں) کو شرمناک کاروبار سے روک دیا۔[۱] "

---

[۱] ہسٹری آف اورنگ زیب جلد سوم ضمیمہ ۵ ص ۲۸۰ بحوالہ " کلمات طیبات " ص ۷۰ ب

یہ شرمناک کاروبار اکثر مندروں میں ہوتا تھا۔ جگناتھ کے مشہور مقدس مندر کے متعلق اس قسم کا خیال کس کو ہو سکتا ہے۔ فرانسیسی سیاح برنیر لکھتا ہے۔

" برہمنوں کا دغا و فریب یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ یہ ایک خوبصورت لڑکی کو جگناتھ کی شادی کے واسطے انتخاب کرتے ہیں جو تمام رات وہاں رہتی ہے۔ رات کے وقت ایک شہوت پرست برہمن ایک چھوٹی سی چور کھڑکی کی راہ سے مندر میں پہونچ جاتا اور اس بیچاری کنواری لڑکی سے جو اس کو جگناتھ سمجھے ہوتی ہے ہم بستر ہوتا ہے .... اور صبح کو ویسے ہی دھوم دھام سے اس کو دوسرے مندر میں لیجاتے ہیں ..... اب ہم ایک اور بیوقوفی کا ذکر کرتے ہیں یعنی جگناتھ کے رتھ کے سامنے بلکہ خاص مندر میں بھی میلہ کے دنوں میں ناچ کے وقت کسبیاں اپنی مختلف حرکات سے نہایت بے شرمی اور بے حجابی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور برہمن ان لغویات کو بالکل اپنے ملک کے مذہب کے مطابق خیال کرتے ہیں[1]۔"

سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے مندر کی ملازم کسبیوں کے متعلق لکھتا ہے۔

" میں کئی ایک خوبصورت کسبیوں کو جانتا ہوں جو باوجود اس پیشے کے نہایت محتاط ہیں۔ یعنی ہر کسی کے پاس نہیں چلی جاتیں "... انہوں نے " اپنے تئیں دیوتاؤں اور برہمنوں اور ان سادھوؤں کیلئے جو ننگے دھونی رمائے اور جٹا دھارن کئے مندر کے چاروں طرف بیٹھے رہتے ہیں وقف کیا ہوا ہے[2]۔"

---

[1] اردو ملخّص شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب ص ۹۷-۹۰م ان (باقی اگلے صفحہ پر)

اس واقعہ اور ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اور مندر بھی جہاں کے برہمنوں، معاد ھوؤں اور مریدوں کی بد اعمالیوں کا علم اورنگ زیب کو اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہوا ہوگا۔ اس نے ان کی بنیادیں تک اکھڑوا دی ہوں گی اس کو مذہبی جنون پر نہیں بلکہ اسکی اخلاقی جرأت اور اصلاحی کوشش پر محمول کرنا چاہیئے۔

اورنگ زیب کے ہاتھوں بعض مندروں کی تباہی ہندوؤں کے تعصب و تشدد اور مسلم دشمنی کی وجہ سے ہوئی جس کا اظہار عہد عالمگیری سے قبل متعدد بار مسجدوں کو ڈھا کر کیا جاتا رہا۔ خود اورنگ زیب کے دور میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے مسجدوں کو منہدم کیا اور ست نامیوں کے فتنہ میں ہندوؤں نے بہت سی مسجدوں کو شہید کیا۔ اورنگ زیب نے جوابی کارروائی میں بعض مندروں کو بلاشبہ تباہ کر دیا۔ لیکن یہ منادر اس کی پر امن رعایا کے علاقوں میں نہیں تھے بلکہ بیشتر اسی دار الحرب سے متعلق تھے جو جسونت اور اس کے ہوا خواہ رانا و دیگر راجپوت راجاؤں کے علاقوں میں تھے۔ کچھ ان علاقوں کے بھی تھے جو وقتاً فوقتاً دار الحرب بنے اور وہاں اس سے قبل مسجدوں کی بے حرمتی اور ان کا انہدام عمل میں لایا جا چکا تھا مثلاً مہاراشٹر، بیجا پور، گول کنڈہ، حیدر آباد متھرا اور کوچ بہار وغیرہ۔ ان میں بھی بعض مقامات پر صرف ان مندروں کو ڈھایا گیا جو نئے تعمیر شدہ تھے یا مسجدوں کی بنیادوں پر تعمیر کئے گئے تھے۔ دوران جنگ تباہ شدہ مندروں کے بعد جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک دوسرے کے معابد کو کسی گنتی و شمار کے بغیر تباہ کرتے تھے ایسے ہی مندروں کی تعداد زیادہ ہے جو جدید تھے اور بادشاہ وقت کے علم کے خلاف تعمیر کئے گئے تھے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ پچھلا) صفحات پر چھپائی کے دوسرے واقعات بھی ملاحظہ کیجئے کلاڈی ایس بکانن نے ۱۸۰۶ء کے قریب تھا بھیمائی کے ان واقعات کا مشاہدہ کیا ہے (ملاحظہ ہو حاشیہ ص ۹٦-۹۱)

اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد ۱۶۵۹ء میں ایک فرمان جاری کیا تھا جو بنارس فرمان کے نام سے مشہور ہے[1]۔ یہ ایک برہمن کی شکایت پر جو کسی مندر کا مہنت تھا اور جس کو بعض لوگ پریشان و خوفزدہ کر رہے تھے بنارس کے مقامی حاکم ابوالحسن کے نام تھا۔ جس میں اورنگ زیب نے لکھا تھا کہ۔

"......اپنے مقدس قانون کے بموجب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ قدیم منادر منہدم نہیں کئے جائیں گے مگر نئے مندروں کی تعمیر ممنوع ہے۔"

خود فاضل محقق نے فرمان کے اس ٹکڑے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"اس فرمان سے یہ بالکل واضح ہے کہ اورنگ زیب نے نئے مندروں کی تعمیر کے خلاف یہ کوئی نیا حکم جاری نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اسلاف سابقین کے اس طریقہ کا اعادہ کیا تھا جو پہلے سے جاری تھا۔ وہ محض اس طریقہ پر عمل پیرا رہنا چاہتا تھا۔ جہانتک قدیم مندروں کا تعلق ہے وہ واضح طور پر ان کے انہدام کا مخالف تھا۔"

نہ صرف یہ بلکہ اورنگ زیب قدیم منادر کے برہمن محافظین اور مہنتوں کے امن و سکون

---

[1] سرکار اور بی این پانڈے دونوں نے اس فرمان کو نقل کیا ہے۔ مگر بی این پانڈے نے اپنے مقالہ بعنوان "اورنگ زیب اور ہندوؤں کے منادر" میں جو جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کے سات شماروں میں بالاقساط اور مختلف عنوانات کے تحت شائع ہو چکا ہے جس میں فاضل مقالہ نگار نے اورنگ زیب کے ۱۵ فرامین و اسناد دیئے ہیں جن سے اورنگ زیب کی مذہبی رواداری پر کافی روشنی پڑتی ہے پورے فرمان کا ترجمہ دیا ہے۔ (جرنل ص ۲۴۷ - ۲۴۸ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

کا ضامن، انکے مذہبی اختیارات کا محافظ اور ان کی گزر اوقات کا کفیل تھا۔ اس فرمان میں اورنگ زیب کی تحریر کے الفاظ یہ ہیں۔

"بعض لوگ بنارس شہر اور اس کے قرب و جوار کے ہنود باشندوں اور مندروں سے برہمن محافظین کو جن کی تحویل میں یہ قدیم مندر ہیں، پریشان کرتے ہیں اور ان کے معاملات میں) مزاحمت پیدا کرتے ہیں، اور مزید یہ کہ وہ لوگ برہمنوں کو ان کے دیرینہ مناصب سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ اس لئے حکم سلطانی یہ ہے کہ اس کے موصول ہوتے ہی تمہیں ہدایت کر دینا چاہئے آئندہ کوئی شخص غیر قانونی طور پر برہمنوں اور دوسرے ہندو باشندوں کو پریشان نہ کرے۔ اور نہ ان کے معاملات میں مزاحمت پیدا کرے تاکہ وہ پہلے کی طرح اپنے کام میں مصروف رہیں۔ اور سکون دماغی کے ساتھ ہماری سلطنتِ خدا داد کی سلامتی اور دولتِ دوام کے لئے دعا گو رہیں اس حکم کو اشد ضروری تصور کیا جائے۔"

بنارس ہی کے ایک اور فرمان میں اورنگ زیب نے مہاراج دھیراج راجہ رام سنگھ کے خاندان کے ایک مذہبی پیشوا بھگونت گوسائیں جیاں وہاں کے تحفظ کیلئے لکھا ہے

"حال و استقبال کے حاکموں کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو ہدایت کر دیں کہ آئندہ کوئی شخص گوسائیں کو ہراساں کرنے کی کوشش نہ کرے"[۱]

---

[۱] تاریخ ۱۷ ربیع الثانی ۱۰۹۱ھ مطابق ۱۶۸۰ء (جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۲۴۸-۴۹)

بنارس ہی کے ایک حاکم کے نام اورنگ زیب کا ایک اور فرمان ہے جس میں اورنگ زیب نے ہندوؤں کے ایک مذہبی پیشوا کی کفالت کے لئے دو قطعات آراضی بطور انعام عطا کئے اور اس میں یہانتک تحریر کر دیا کہ۔

"ہمارے بلند اقبال فرزند اعلیٰ مرتبت وزرار، پاک طینت امرار اور اعلیٰ حکام، داروغہ اور کوتوال ہمارے اس حکم پر نور کے اجرار وعملدرآمد پر مستقلاً نگاہ رکھیں اور محولہ بالا قطعات کو متذکرہ افراد اور نسل در نسل ان کے ورثاو کے قبضہ میں رہنے دیں اور انکو تمام محصولات سے مستثنیٰ تصور کریں علاوہ ازیں ہر سال ان سے نئی سند طلب نہ کریں[۵]۔" (بتاریخ ۱۰۹۱ھ ۱۶۸۹ء)

یہ دونوں فرامین ہندوؤں کے مقدس شہر بنارس کے حاکم کے نام ہیں جہاں ایک مندر کو اورنگ زیب نے مسمار کرایا۔ اور پاٹھ شالاؤں کو بند کرا دیا۔ اس کا سبب متذکرہ بالا فرامین کی روشنی میں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ مندر کی متعلقہ پاٹھ شالا اور دیگر ہندو مدرسوں نے اورنگ زیب کی انتہائی مذہبی رواداری کے باوجود مسلمانوں کے عقائد کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا تھا۔ مستعد خاں ساقی کا بیان ہے کہ

"بادشاہ دین پناہ کو معلوم ہوا ہے کہ صوبہ ٹھٹھہ اور ملتان میں بالعموم اور بنارس میں بالخصوص برہمنوں نے مدارس قایم کئے ہیں اور کتب باطلہ کے درس تدریس میں مشغول ہیں ہندو و مسلم طلبا و دور دراز مقامات سے سفر کر کے ان علوم کی تحصیل کے لئے آتے ہیں قبلۂ عالم نے عام صوبہ جات کے نظمار

---

[۵] جرنل آف پاکستان — ہسٹاریکل سوسائٹی۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۲۵۰

کے نام فرامین جاری کئے کہ یہ مدارس مسمار کر دئے
جائیں اور ان علوم کی درس و تدریس کی تاکید کے ساتھ ممانعت
کی جائے[1]"

ہندوؤں کے مسلمانوں کو سبق پڑھانے اور ان کو اورنگ زیب کے درس عبرت دینے کے جواز میں لین پول رقمطراز ہے۔ کہ

"جو کچھ کیا گیا وہ درس عبرت دینے اور برہمنوں کو متنبہ کرنے کے لئے تھا کہ وہ حق کے سچے پرستاروں میں تبدیل مذہب کی کوششوں سے باز آجائیں اس مقصد کے تحت اس نے وشنو کے مندر واقع بنارس اور متھرا کے ایک شاندار مندر کو منہدم کرا دیا[2]"

دراصل ہندوؤں کے مدارس مسلمانوں کے مدرسوں کی طرح بڑے بڑے معابد ہی سے متعلق ہوتے تھے۔ اس لئے مدرسوں کی تباہی کے معنی ان معابد کی تباہی ہے جبیں وہ واقع یا متعلق یا متصل ہیں۔ یعنی ان کو باعتبار مندر تباہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ "درس و تدریسِ باطلہ" کے مراکز کی حیثیت سے ان کی تباہی عمل میں آئی' یہاں یہ بات بھی محل غور ہے کہ یہ دونوں فرمان اس دور کے ہیں جس کے متعلق مورخین یہ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے زیادہ تشدد اختیار کر لیا تھا۔

جلوس کے نویں سال ۲ صفر کو آسام کے دارالاسلام بنا لینے کے فوراً بعد ایک فرمان[3] جاری

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۵۹ [2] اورنگ زیب از لین پول ص ۳۶-۱۳۵ کلیرنڈن پریس آکسفورڈ سنہ ۱۸۹۳ء

[3] فرماں کا پورا ترجمہ جے نان چند نے اپنے مقالہ میں دیا ہے ملاحظہ کیجئے جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء ص ۲۵۱

کیا جس میں اُمانند مندر واقع گوہاٹی صوبہ آسام کے پجاری سدامن برہمن کے لئے وہ تمام مراعات واسباب کفاف کی تجدید تھی جو آسام کے سابقہ ہندو حکمراں نے اس مندر اور اس کے پجاری کے لئے مہیا کئے تھے۔ اس پر جے نان چندر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اپنی ہندو رعایا کے مذہبی جذبات کے احترام میں بہت محتاط تھا۔

اسی احتیاط واحترام کا ایک اور ثبوت صفحہ ۲۵۱ کے حاشیہ پر دیا ہے لکھتا ہے۔

"اپنی رعایا کے احساسات کا خیال اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے آسام میں ایسے سکے جاری کئے جو بنگالی میں ان کی قدیم روایات کے حامل تھے۔"

اس فرمان اور جے نان چندر کی رائے کے پیش نظر ہمیں آسام و کوچ بہار کے مندروں کی تباہی کے سلسلہ میں سرکار کے بیان میں سراسر تعصب[1] اور لاعلمی، اور ساقی کی تحریر میں ایسی شدت نظر آتی ہے جس میں آنکھیں صحیح اسباب وعلل دیکھنے سے قاصر ہوتی ہیں۔

احمد آباد کے مشہور چنتامن مندر کی تباہی بھی اورنگ زیب کے الزامات میں شامل ہے۔ جے نان چندر اس کی تردید میں لکھتا ہے کہ۔

"عام طور پر مورخین چنتامن مندر کی تباہی کو پیش کرتے ہیں جس کو احمد آباد کے ناگر سیٹھ نے تعمیر کیا تھا مگر اس حقیقت کے بیان پر ان کی زبان گنگ ہو جاتی کہ اسی ناگر سیٹھ کو اورنگ

---

[1] سرکار جلد سوم ص ۱۵۱-۲ ممکن ہے دوران جنگ کچھ مندروں کی تباہی ہوتی ہو یا نئے مندروں کو منہدم کرایا گیا ہو۔

زیب ہی نے شتر بجیہ اور آبو کے مندروں کو اخراجات کے لئے لئے قطعات آراضی عطا کئے تھے۔"

اس ذیل میں جے نان چندر نے دو فرامین (مورخہ ۹ رمضان سنہ ۱۰۶۵ھ م سنہ ۱۶۵۵ء اور ۱۰ رجب سنہ ۱۰۷۰ھ م ۱۲ مارچ سنہ ۱۶۶۰ء) کے تراجم دئے ہیں [1]

جے نان چندر نے اپنے مقالہ کی دوسری قسط بعنوان "ہندو پجاریوں کو عالمگیری بخشش" [2] کے تحت تیرہ [13] پروانوں اور سندوں کے تراجم مع فارسی متن پیش کئے ہیں جو مالوہ کے عالمگیری گورنروں کی جانب سے اجین کے برہمن خاندان کی گزر اوقات کے بندوبست کے لئے متصدیان کو وقتاً فوقتاً بھیجے گئے ان تیرہ [13] پروانوں کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کے عہد میں جو بخششیں اور عطایا دئے گئے وہ اس کے دور میں ہمیشہ جاری رہے۔"ان فرامین میں تسلسل قایم کرنے کے بعد یہ کہنا غلط ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے دور کے آخری نصف میں بہت زیادہ متشدد اور متعصب ہوتا چلا گیا۔ اسی سلسلہ میں خود عالمگیر کا سنہ جلوس ۴۳ میں جاری کردہ ایک فرمان مع فارسی متن موجود ہے۔ جس میں ایک برہمن کو ۲ پرتن اراضی لایق زراعت در وجہ خیرات دینے کا حکم ہے [3] جے نان چندر لفظ خیرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کی خیرات صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔" [4]

---

[1] ملاحظہ کیجئے مقالہ از جے نان چندر۔ جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء ص ۲۵۲۔ ۲۵۴ [2] جے نان چندر۔ جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جنوری سنہ ۱۹۵۸ء بقول فاضل مقالہ نگار یہ اسناد ابتک مہاکلیشور مندر کے پجاریوں کے پاس محفوظ ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں یہ پجاری اسی برہمن خاندان سے متعلق ہیں۔ [3] جے نان چندر جرنل مذکور اپریل سنہ ۱۹۵۹ء (مقالہ کی ساتویں قسط) [4] جے نان چندر جرنل مذکور ماہ اپریل ۱۹۵۹ء ص ۹۹۔

یہ صرف اس نے ہندو پجاریوں اور مہنتوں کی سرپرستی کی بلکہ ہندو سنیاسیوں اور فقیروں تک کی سرپرستی میں بھی کوتاہی نہیں کی ایک مرتبہ متصدیانِ بیت المال نے بنارس کے جنگمباری جماعت کے ناتھ کی پانچ حویلیوں پر قبضہ کر لیا اور پانچسو روپیہ[۵] بطور کرایہ ان سے وصول کر لیا۔ اورنگ زیب نے یہ معاملہ نور اللہ مفتی کو بھیجا اور انہوں نے یہ فیصلہ دیا۔

"..... ہر چہ از وجہ کرایہ از رافع گرفتہ باشند واپس بدہند، وحویلی ہائے مذکور را بدستور سابق برافع واگزارند و بہ ہیچ وجہ متعرض و مزاحم حال رافع نشوند کہ بجائے و مقام خود آباد بودہ باشند[۵]"

اسی طرح ایک فرمان جین سادھو جن چندر سوری کے متعلق ہے جس میں اس نے سادھوؤں کے معاملات میں مزاحمت نہ کرنے کے لئے "جاگیرداران و فوجداران و کروریان و زمینداران پرگنات ممالک محروسہ[۵]" کو بڑی تاکید کے ساتھ لکھا تھا۔ جے نان چندر کے جمع و فراہم کردہ فرامین میں لطف کی بات یہ ہے کہ عالمگیر پر منادر کے مسمار کرنے کے الزام کی تردید خود وہ منادر ہی کر رہے ہیں جو آج بھی ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ بقول جے نان چندر۔

"اگر تفحص و تلاش سے کام لیا جائے تو ہمیں یقین کامل ہے کہ اس قسم کی بہت سی شہادتیں منظر عام پر پکاریں گی کہ اورنگ زیب کا۔"

لے جے نان چندر جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی جولائی ۱۹۵۸ء ص ۲۰۹

۲ے " " " " " " " " جنوری ۱۹۵۹ء ص ۳۸-۳۶

ملاحظہ کیجئے فرمان اور اصل فرمان کا عکس۔

برتاؤ غیر مسلموں کے ساتھ نہایت فیاضانہ اور روادارانہ تھا[1]"

ہندوؤں کے اشنان کے مقدس گھاٹوں اور مقدس معابد کی یاترا کرنے والوں کے محصولات معاف تھے[2] اور اس طرح اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مذہبی حقوق کو محسوس کرتے ہوئے کروڑوں روپیہ کا نقصان اُٹھایا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے راہ گھاٹ پر بیٹھنے والے دوکانداروں اور راہداری کے محصولات بھی معاف کر دیے تھے خافی خاں لکھتا ہے کہ۔

"بادشاہ نے راہداری اور بانداری کے محاصل کی ممانعت کے لئے مسلسل احکام جاری کئے حالانکہ ان مدات میں لاکھوں روپیہ سرکار میں جمع ہوتا تھا۔[3]"

لین پول نے کم از کم اسی کو اورنگ زیب کے محاسن میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس نے (عالمگیر) غیر مسلموں کے مذہبی میلوں اور تہواروں پر لگے ہوئے محصولات کو معاف کر کے اپنے خزانہ کو خالی کر لیا[4]"

اور بقول سرکار ۱۶۶۸ء میں اورنگ زیب نے ایسے میلوں کو تمام ممالک محروسہ میں ممنوع قرار دیدیا[5]"

---

۱ جے نان چندر جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اکتوبر ۱۹۵۶ء ص ۲۵۴ ۲ ڈاکٹر غوری صاحب نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ داراشکوہ نے شاہجہاں پر زور ڈال کر یاترا کا ٹیکس معاف کرا دیا تھا۔ (کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔) ممکن ہے اورنگ زیب نے بھی اس کو معاف ہی رکھا ہو۔ یاترا ٹیکس کے متعلق خافی خاں کا بیان مبہم ہے، عالمگیر نامہ بھی خاموش ہے ۳ خافی خاں ص ۹۶-۹۵ ۴ میڈیول انڈیا۔ جلد سوم ص ۲۴۲ مطبوعہ سوشیل گپتا لمیٹڈ انڈیا۔ لین پول نے بھی اس معافی کے متعلق کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

۵ سرکار جلد سوم ص ۲۷۹۔

سرکار نے خافی خاں کے حوالہ سے یہ لکھا ہے لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"مسکرات اور نشہ بازی کے رواج کو ختم کرنے کے لئے شراب
خانے بند کرا دیے اور یاترا کے اجتماعات پر بھی پابندی لگا دی"[1]

خافی خاں نے جن مخرب اخلاق چیزوں کے ساتھ "جاترا کے اجتماعات" پر پابندی لگانے کا ذکر کیا ہے اس سے اورنگ زیب کا مقصد بے حیائی کے اجتماعات سے ہے۔ مقدس یاترا سے نہیں۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوؤں کی جاتراؤں اور میلوں ٹھیلوں میں جن عیاشیوں اور اخلاق و انسانیت سوز حرکات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا وہ ایک پاکباز اور دیندار بادشاہ کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ پھر یہ کہ ان کا تعلق نہ صرف ہندوؤں بلکہ مسلمانوں سے بھی تھا۔ بقول سرکار

ہندوستانی مسلمان جو کسی طرح ہندوؤں سے کم نہیں۔
(ان میلوں میں) جمع ہوتے تھے۔ یہاں کی تفریحات، تجارت
اور سعادت میں حصہ لیتے تھے[2]"

مسلمانوں کو ان اجتماعات میں شرکت سے روکنے کے لئے اورنگ زیب کے لئے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس کے تحت اس نے عرس وغیرہ جیسے مسلمانوں کے اجتماعات پر بھی پابندی لگائی تھی۔ مگر یاترا جاری رہی اور اس کو کسی صورت سے نہیں روکا جا سکتا تھا نہ اس کا یہ منشا تھا۔ بلکہ اس نے اس ضمن میں تو ہندوؤں کو سہولتیں بہم پہونچائیں۔

لیکن اتنے محصولات کی معافی کے بعد اور تقریباً ۲۰-۲۱ سال نقصان برداشت کرنے کے بعد تخت نشینی کے بائیسویں سال جب اس نے ہندوؤں پر شرعی سے زیادہ مالی و ملکی ضرورت کے تحت ایک ٹیکس جزیہ کے نام سے عائد کیا تو تمام ہندو بوکھلا اٹھے مرنے مارنے

---

[1] خافی خاں ص ۱۹۶ [2] سرکار جلد سوم ص ۲۷۹

پر آمادہ ہو گئے۔ مگر مسلسل جنگوں کی وجہ سے خزانہ خالی تھا۔ اس کے علاوہ جزیہ قرآنی ٹیکس تھا۔ جس کا نافذ ہونا ضروری تھا۔ ادھر مرہٹوں کی روز افزوں غارتگری کی وجہ سے دکن کی مہم پیش نظر تھی۔ اتنی دور و دراز اور دشوار طلب مہم کے لئے کافی خزانہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے اورنگ زیب شرعی نقطۂ نظر کے تحت اسی قسم کا ٹیکس عائد کر سکتا تھا اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی شرعی صورت نہ تھی۔ پھر یہ کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ کی فرضیت کو قایم کرنے اور واجب الادا قرار دینے کے بعد انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ ہندؤوں پر جزیہ کو لازمی قرار دیا جائے اس نے انصاف کے خلاف کسی آواز کو نہیں سنا۔ جو سختی اور رعایت زکوٰۃ کی وصول میں برتی گئی وہی جزیہ کے سلسلہ میں برتی گئی۔ جس طرح وہ زکوٰۃ کی معافی کو قبول نہیں کر سکتا تھا اسی طرح جزیہ کو بھی ترک نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر کسی کی آمدنی میں تخفیف ہوئی یا کوئی بیماری آزاری ہوتی تو اس نے جزیہ اور دیگر خراجی رقوم کو اکثر و بیشتر معاف کر دیا۔ جو لوگ رقم یکمشت سالانہ ادا نہیں کر سکتے تھے انہیں یہ رعایت دی کہ وہ بالاقساط ادا کر دیں۔ تمام ہندو سرکاری ملازمین (فوجی و غیر فوجی)، بیمار مفلوج۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، محتاج اور دیوانے اس سے مستثنیٰ تھے علاوہ ازیں جزیہ کی رقم سالانہ مقرر تھی۔ لیکن زکوٰۃ کی رقم نصاب کے بڑھنے پر بلحاظ شرح زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ زکوٰۃ فوجی و غیر فوجی سب پر واجب تھی۔ جزیہ کے خلاف ہندؤوں کی واویلا انکی ناسمجھی اور خود غرضی پر مبنی تھی۔ وہ اس محصول کو اکبر سے قبل بلا پس و پیش ادا کرتے تھے۔ اس لئے اب اس میں کسی سبکی کا سوال بھی بے معنیٰ تھا۔ ان کی جرأتوں نے حد سے متجاوز ہو کر محض آمادۂ پیکار ہونا سیکھ لیا تھا۔ اس پر بھی اس کی مذہبی رواداری صاف طور پر نمایاں تھی۔ اگرچہ اس نے ہندو راجپوتوں اور مرہٹوں کی مہم بغاوتوں اور سرکشی کے سبب مالی مشکلات میں گھر گیا تھا۔ اور ممکن تھا کہ وہ انتقاماً جزیہ کی

وصولی میں انتہائی جبر و تشدد کا مظاہرہ کرتا۔ یہاں لین پول کا بیان محل غور ہے لکھتا ہے کہ

"جزیہ کی رقوم کی وصولیابی کے متعلق صرف اتنا ملتا ہے؛

محض برہان پور شہر سے ۲۶۰۰۰ روپیہ اس مد میں وصول ہوئے۔ اور اگر یہ ٹیکس کبھی بھی سختی سے لگایا گیا ہوتا جو غیر یقینی امر ہے تو پورے ہندوستان سے اس مد میں وصول شدہ رقوم کا میزانیہ بہت زیادہ ہوتا۔

مگر اس کے جذبۂ رواداری اور ترحم نے کبھی مذہبی تشدد کو پسند نہیں کیا۔ وہ ایک وسیع مملکت اور دور بڑی قوموں کا فرمانروا تھا اسی طرح اس کی فکر و نظر میں وسعت، مزاج میں اعتدال اور کردار میں استقلال تھا۔

اس کی حکومت کے ہزاروں اراکین ہندو تھے فوجی اور ملکی دونوں قسم کے اہم عہدوں پر فائز تھے شعبۂ مالیات میں ان کی اکثریت تھی شعبۂ مالیات کے سربراہ ایک عرصہ تک ہندو رہے۔ ہندوؤں کے محبوب ترین مغل بادشاہوں اکبر اور جہانگیر کے دور کے ہفت ہزاری سے یک ہزاری منصب تک کے منصب داروں کی کل تعداد کے مقابلہ میں عہد عالمگیری کے ہندو منصب داروں کی تعداد بہت زیادہ تھی[۲]

(اکبر کے دور میں کل منصب دار ۲۵۔ جہانگیر کے دور میں ۲۶۔ عالمگیر کے دور میں ۶۷ یعنی دونوں کی مجموعی تعداد سے صرف ۴ کم۔ اور اس صورت میں جبکہ عالمگیر کے

---

[۱] اورنگ زیب از لین پول ص ۱۲۵ کلیرینڈن پریس۔ آکسفورڈ ۱۸۹۳ء۔

[۲]۔ منشی محمد سعید احمد نے "امرائے ہنود" میں ص ۴۱ پر اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانوں کے ہندو منصب داروں کی تعداد بلحاظ منصب علیحدہ علیحدہ دی ہے۔

عہد کی کوئی مکمل فہرست کسی تاریخ میں موجود نہیں۔[1] تاہم ان کے علاوہ ملکی اور فوجی
ملازمتوں میں بہت سے ہندو ملازم ہوں گے جن کا شمار کسی زمانہ میں بھی نہیں کیا جاسکتا
مگر بقول سرکار[2] "ہندو پیشکاروں نے مغل سپاہیوں کے ساتھ زیادتیاں[3]" کرنا شروع
کر دی تھیں جب عالمگیر کو اس تحقیر آمیز سلوک کی اطلاع ملی تو صوبہ داروں اور
صوبہ کے حاکموں کے نام ایک اور فرمان یہ جاری ہوا کہ صوبہ دار، تعلقہ دار، پیشکار اور
دیوانی کے عہدہ دار ہندوؤں کو برطرف کر کے ان کی جگہ مسلمانوں کو مقرر کریں۔ دیوانی
کے عہدہ داروں کو ہدایت دی گئی کہ محالات خالصہ کے کروڑی صرف مسلمان ہی مقرر
کئے جائیں[4]" مگر اس کا نفاذ نہیں ہوا۔ خود خافی خاں رقمطراز ہے۔ "حاکموں کی
پیشکاری سے ہندوؤں کی برطرفی کا معاملہ بھی سختی نہ ہونے کے سبب معطل ہی رہا۔ بعض
بعض شہروں میں کچھ عرصہ تک ہندو کروڑی برطرف رہے اور ان کی جگہ مسلمان
مقرر ہوئے۔ بعد میں ایسا عمل درآمد ہو گیا کہ دیوانی کے دفاتر اور سرکاری بخشیوں کی
پیشکاری میں ایک پیشکار مسلمان ہوتا تھا تو دوسرا ہندو[5]" دراصل یہ فرمان ہندو
پیشکاروں کے ناروا سلوک کے جواب میں محض تنبیہ کے طور پر جاری کیا گیا تھا اور دیوانی
کے عہدے داروں سے خاص طور سے متعلق تھا۔ اس کی وجہ بقول شبلی یہ تھی کہ
"ان عہدوں (کروڑی) پر اکثر کایستھ مقرر ہوتے تھے۔ جو رشوت لینے میں مشہور ہیں
اس حکم کو مذہبی تفریق سے کوئی تعلق نہ تھا[6]" پھر یہ کہ جس بادشاہ نے دو پارسی
ملازموں پر ایک شخص کے اعتراض کے جواب میں کہا ہو کہ "مذہب کو دنیا کے کاروبار

---

[1] امرائے ہنود از منشی محمد سعید احمد ص ۱۳-۱۴ مطبوعہ نامی پریس کانپور سنہ ۱۹۱۰ء
[2] اسٹڈیز ان مغل انڈیا از سرکار۔ ص ۶۳-۱۶۲ [3] خافی خاں ص ۲۲۹۔
[4] خافی خاں ص ۲۳۲ [5] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر۔ از شبلی ص ۶۲

میں کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو کوئی جگہ مل سکتی ہے[۱]۔" اپنے اس قول کی تائید میں اورنگ زیب نے یہ آیت لکھدی لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن اور یہ بھی تحریر کیا کہ "اگر یہی دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہئے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤنکو اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگونکو ان کی لیاقت کے موافق ملیں گی۔ اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں[۲]۔" اس پر یہ الزام کہ قانونگوئی مسلمان ہونے کی شرط پر ملتی تھی[۳]۔" یا اس نے ضرورت کے تحت اپنے پچھلے حکم میں نرمی برتی[۴]۔" قطعی افترا پردازی اور الزام تراشی ہے۔

حق یہ ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی رواداری، شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی آپ مثال ہے۔ مگر حق ہم ہی سے ادا نہ ہوا۔ تاہم وہ پر امن ہندوؤں کے لئے نہایت مشفق و مہربان تھا۔ ہندو محقق جے نان چندر لکھتا ہے کہ "اس زمانہ (عہد عالمگیری) کے ادب میں اس قسم کی بہت سی شہادتیں ملتی ہیں کہ عالمگیر ہندوؤں کے لئے کسی خوف و خطر کا موجب نہیں تھا[۵]۔" ذیل میں اس نے ایک جین گجراتی شاعر کے چند

---

[۱] امرائے ہنود۔ ص ۔۴ بحوالہ دعوتِ اسلام ص ۲۷۸ از آرنلڈ۔ آرنلڈ نے اورنگ زیب کے فرامین اور مراسلات کا ایک قلمی نسخہ مولوی عبدالسلام صاحب کے پاس دیکھا تھا آرنلڈ کا یہ بیان اس سے ماخوذ ہے۔ رشید اختر ندوی نے یہی بیان احکام عالمگیری سے نقل کیا ہے اور لکھتا ہے کہ سرکار نے اپنے ترجمہ میں ان جملوں کو حذف کو دیا ہے جو پہلے ایڈیشن میں یہ موجود تھے۔ [۲][۳] سرکار جلد سوم ص ۲۷۷ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ کلکتہ۔ ایم۔ سی۔ سرکار اینڈ سنز ۱۹۲۱ء۔

[۵] جے نان چندر۔ جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی اپریل ۱۹۵۸ء ص ۱۲۴۔

اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ اشعار کا مفہوم یہ ہے۔

"اورنگ زیب یہاں کا بادشاہ ہے۔ اس کے احکام بلا تامل و پس و پیش بجا لائے جاتے ہیں۔ اس کی سلطنت میں کسی فرد واحد کو کسی قسم کا ڈر و خوف نہیں ہے اور یہ ایک بادشاہ کا اس کی رعایا کے لئے بیش قیمت عطیہ ہے[۱]۔"

ایک اور جین شاعر منی راجچند کے اشعار پیش کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

"شہنشاہ اورنگ زیب بہادر اور جواں مرد ہے اس کے دورِ حکومت میں، میں نے یہ کتاب بڑے امن و سکون سے لکھی ہے[۲]۔"

ہندی زبان میں مہابھارت کے مترجم سیال سنگھ چوہان کا ایک شعر اسی سلسلہ میں پیش کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔

"اورنگ زیب دہلی کا سلطان ہے اسکی شہرت تمام عالم میں ہے[۳]۔"

ان اشعار کا حوالہ دینے کے بعد جے نان چندر رقم طراز ہے کہ۔

"اگر وہ ذرا بھی ظالم و جابر ہوتا تو کوئی ہندو یا جین شاعر جس کا کوئی تعلق اس کے دربار سے نہیں تھا اس طرح اس کی تعریف و توصیف نہیں کرتا[۴]۔"

---

[۱] جے نان چندر جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اپریل ۱۹۵۹ء ۱۲۲-۲۵ [۲] مطابق [۱] ص ۲۵

[۳] ,, ,, ,, ,, ,, ,, ص ۱۲۵ [۴] ,, ,, ,, ,, ۸۳

سخاوت مرزا

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر

(۱) دکن کے سجادہ نشیناں

(۲) عام رواداری

اورنگ زیب عالمگیر ملکی اور سماجی اصلاحات کے علاوہ خانقاہی نظام پر بھی نظر رکھتا تھا۔ اور اس بات پر زیادہ نظر رکھتا تھا کہ ہمارے صوفیائے کرام اور سجادہ نشینان عظام صرف خانقاہ کے شیر نہ رہیں بلکہ بقول علامہ اقبالؒ "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری" اشاعت اسلام و تعلیم میں کامل جدوجہد کریں اور ایک کامل درویش کی طرح شرع کے سخت پابند رہیں۔ بدعات کو ترک کر دیں۔ اور اپنی درویشی کو چھوڑ کر عاجزی و خاکساری اور اخوتِ اسلامی کی فضا پیدا کریں۔ دکن کے سجادگان کی اسنادِ معاش پر عالمگیر کی ایک خاص مہر بھی میری نظر سے گذری، جو مولانا سید حسینؒ سجادہ نشین روضہ بزرگ حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہ کے نام ہے جس کی عبارت یہ ہے :۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ
عالمگیر ابو المظفر محمد محی الدین - بادشاہ غازی

(مع صراحت اسماء گرامی اجداد)

بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا سید قطبی حسینی سجادہ روضہ بزرگ مذکور کے فضل و کمال کو سنکر عالمگیر نے ملاقات کی خواہش کی تھی، مگر "صوفی سرمد" کے قتل کی وجہ سے حضرت موصوف متاثر تھے اس لئے آپ سے عالمگیر کی ملاقات تو ہوئی مگر حضرت موصوف کچھ چیں بجبیں رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو عالمگیر نے سجادگی سے معزول کردیا (تاریخ محمدیہ)

بادشاہ سجادگان کا بڑا احترام ملحوظ رکھتا تھا۔ چنانچہ فرمان مذکور جو مولانا سید حسین اکا موسومہ ہے حسب ذیل الفاظ سے مخاطبت فرمائی ہے۔

"زبدۃ السادات السالکین قدوۃ المشائخ المتقین سید
محمد گیسو دراز علیہ الرحمہ، سیادت مرتبت سید حسین
سجادہ نشینی روضۂ مذکور سید حسین بے شرکت غیرے
مرحمت فرمودیم کہ بہ لوازم و مراسم آں کماینبغی پرداختہ
بدعتے نگردد۔ سال بست و پنجم از جلوس والا نوشتہ شد
۱۰۷۲ھ جلوس عالمگیر۔ (سند مخزونہ کتبخانہ خانقاہ روضتین
گلبرگہ شریف)

عالمگیر اور بحری رح عالمگیر ایسے درویشوں کو جو شرع کے پابند نہ تھے متنبہ کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ کسی نے حضرت بحری رح کی عالمگیر سے شکایت کردی عالمگیر نے قاضی لشکر حبیب اللہ کو مع خدم وحشم کے بحری رح کی تادیب کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ بحری رح کے الفاظ یہ ہیں۔

"نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ بحکم بادشاہ
عالمگیر خلد اللہ ملکہ بر بڑنایک دارث واکن گیرہ بافوج
بیکراں رسیدہ بود شخصے از مقربان نواب پیش نواب از

فقیر نگہ کرد، نواب مشارٌ الیہ قاضی حبیب اللہ قاضی لشکر را کہ

دراں روزہا درویشے را بہ سبب گفتگوے خلاف شرع شریف

بجاں گشتہ بود طلب کرد و گفت کہ بہ تکیہ فلاں فقیر کہ در گوئی است

شما خود بروید و بہ بینید چنانچہ گویند اگر ہمچناں است بنوعے

تنبیہ نمایند کہ عبرت بدیگراں رسد، غرض بہ تکیہ فقیر

با حشام و خدام خود رسید، و بعد سلام بہ نشست، بدل

خود تجویز کردم کہ اگر چیزے بہ پرسد ہیں باید گفت کہ اے

محتوی اسلام ہر چہ بمن خوش آمد من کردہ ام و آنچہ بہ شما

بہتر نماید شما بکنند، گفتگوے دراز از بہر حیثیت خدائے

تعالیٰ خیرش دہد کہ ہیچ نپرسید و رفت، (عروس عرفان قلمی)

ونوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۵ء)

عالمگیر ایک درویش منش، جفاکش اور قوی سمار تھا، اس کو شعرا کی بیجا خوشامد مدحت سرائی پسند نہ تھی، جب وہ لکھتا ہے کہ "شکار کار بیکاران است" تو پھر شعر گوئی اس کو کب پسند آسکتی ہے۔ جب کہ اس کو "مرغ بچگان گرفتن" سے فرصت نہیں تاہم عالمگیر سخن شناس اور نکتہ سنج تھا۔ بعض وقت تفنن طبع کے طور پر شعر کہتا تھا۔ اس کے دور کے مشہور شعرا ناصر علی سرہندی، مرزا بیدل، نعمت خان عالی، آرزو، بلکہ جعفر زٹلی بھی ہے جو کہتا ہے ؎ دریں پیر سالی و ضعف بدن * کجائی دھما چوکڑی در دکن دکن کے شعرا میں نصرتی، ولی بابائے ریختہ، فایز دہلوی، بحری، برکت اللہ، پیمی وغیرہ ہیں۔ تذکرہ شمع انجمن میں عالمگیر کی ایک رباعی درج ہے، جو اس کی قبل از حصول تخت شاہی کی غمازی کرتی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے ؎

دیروز پئے گلاب می گردیدم   پژمردہ گلے بر سر آتش دیدم

گفتم چہ کردہ کہ می سوزندت   گفتا کہ درین باغ دمے خندیدم

مولانا شیخ محمود بحری (دکنی) نے عالمگیر کی ایک اور رباعی کی شرح بھی خوب فرمائی ہے کیونکہ وہ نایاب ہے درج ذیل کی جاتی ہے :-

رباعی

سلطنت را عزتے در عالم فانی کجاست   ما گدایانیم مارا عیشِ سلطانی کجاست

ایں دلِ دیوانہ را گفتم کہ عاشق شو نشد   آرے آرے طفل را میل سبق خوانی کجاست

ذکر مصرع نخستیں آنست کہ سلطان اورنگ زیب غازی خلد اللہ ملکہ صاحب ایں رباعی است، سلطنت را در اصطلاح خود درویشی قرار دادہ، چنانچہ ع

گدا بادشاہست و نامش گداست

والحق درویش چوں بکمال رسد سلطان غیب و شہادت می شود و از جزو کل مطیع و منقاد او گردد، ایں سلطان و سلطنت را در عالم فانی یقین است کہ عزت نباشد و ہر کس حقیرش می شمرد۔ ع

ما گدایانیم مارا عیش سلطانی کجاست

ما کہ بادشاہیم فی الحقیقت گدایانیم پس مارا عیش ایں سلطانی کہ مراد از درویشی باشد کجاست " ع

ایں دلِ دیوانہ را گفتم کہ عاقل شو نشد

سلطان مشارٌ الیہ پیش از جلوس تخت مایل بدرویشی بود می گوید کہ ایں دل دیوانہ خود را گفتم کہ خبردار شو یعنی سر بادشاہی از سر بدر کن وایں درویشی را از دست مدہ نشنید

وبہاں طرف ملتفت گردید، دید کہ میل بدنیا نمود ازراہِ
ندامت گفت۔ ع

آرے آرے طفل را میل سبق خوانی کجاست

یعنی :۔ طفلِ دل را طلب این سبق خوانی کہ کنایت از فقر است کجاست، و
مقرراست کہ سبق خوانی اگرچہ سرمایۂ زندگانی است اما طفل ترکیب
لہو ولعب است، ازاں گریزاں باشد، آفریں باد کہ بادشاہِ
دیں پناہ عذر کردار بدرگاہ پوزش پذیر حضرتِ پروردگار بطریق
احسن پیش آورد، بل گوئے قبولیت بوسیلہ ہمیں عذر ۔۔۔۔ برد
خدا تعالیٰ بہ ہمہ حالش حافظ باد وناصر ؎

بجری بدعائے داور از دوست
درخواہ کہ بر تو ہم حق اوست

راجہ پیڈ نایک، بیڈر قوم کا ایک بہادر راجہ تھا۔ علاقہ کرناٹک
میں وجیانگر، سگر، بیڈر، شوراپور میں یہ قوم آباد تھی۔ عادل شاہی
اور شیواجی مرہٹہ کی فوج میں بھی اس قوم کے بہت سے افراد ملازم تھے
پیڈنایک ولد پام نایک اول کے قبضہ میں واکن گیرہ کا مشہور قلعہ تھا۔
مگر عالمگیر نے بالآخر شیواجی مرہٹہ کے علاوہ اس بہادر راجہ کو بھی زیر کیا۔ باوجود
اس کے، اس کے ساتھ مدارات اور رواداری میں کوتاہی نہ کی عالمگیر اس کو ایک
فرمان میں عمدہ الفاظ میں اس طرح مخاطب کرتا ہے :۔

" زبدۃ الاشال والاقران لایق عنایتِ والاحسان
پیڈنایک بعنایت بادشاہانہ مفخر ومباہی بودہ بداند
کہ دریں ولا از پیش گاہ خلافت وجہانبانی از فضل وکرم

تقصیرات آں زبدۃ الامثال والا قران عفو شد و سر دیکھی

نصرت آباد د عفو بدستور شد ......

پام نایک پسر خود را بہ طمانیت خاطر بر کاب ظفر

انتساب بفرستند کہ بنوارشاتِ بادشاہانہ د عطائے

منصب سربلندی یابد" .... ۔

رواداری اور ہندوؤں کے نام جاگیرات ورنگ زیب نے ہندوؤں کے ساتھ بڑا التفات

اور رواداری برتی۔ چنانچہ مولف تصحیح التواریخ لکھتا ہے کہ:۔

"چناں قرار یافت کہ از جملہ پیشکاران دفتر دیوانی بخشیانِ

سرکار، یک پیشکار ہندو و یک مسلمان مقرر شود۔"

مگر اس میں تاریخ فرشتہ کا حوالہ غلط ہے۔ ایشوری پرشاد ایک ہندو مورخ

کا بیان ہے کہ "اگر عالمگیر کہیں فوج روانہ کرتا تو اس کے ساتھ دو افسر مقرر کرتا

ایک ہندو دوسرا مسلمان۔" (تاریخ ہند ایشوری پرشاد بحوالہ

تصحیح التواریخ۔ ص ۳۴)

کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرتے ہیں آتش پرست

ہیں، ان کو برخاست کر دیا جائے۔ عالمگیر نے اسی درخواست پر لکھا کہ "مذہب کو دنیا

کے کاروبار میں دخل نہیں اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے" (پریچنگ

آف اسلام، آرنلڈ)۔

عالمگیر کی فوج میں راجپوت تعدار بھی تھے۔ چنانچہ تاریخ امرائے ہر

مولفہ محمد سعید مارہروی میں ان کی طویل فہرست موجود ہے۔ مثلاً"

اودے سنگھ، شیو سنگھ، کالوجی وغیرہ۔

نیز اس کی فوج میں عیسائی افسر بھی تھے اور رومن کیتھولک گرجے بھی موجود تھے۔ (سفرنامہ کریمری اٹالین سیاح)

عالمگیر نے ہندو قوم کے ساتھ رشتۂ ازدواج قایم کرنے میں تعصب نہیں برتا چنانچہ شہزادہ معظم کی شادی راجہ انوپ سنگھ کی لڑکی سے کی (واقعات ہند)

عالمگیر نے نہ صرف ہندوؤں بلکہ، پارسی و عیسائی قوم کے ساتھ بھی رواداری برتی جنکو مذہبی آزادی کما حقہ حاصل تھی۔ (سفرنامہ ہملٹن ملاحظہ ہو)

مندروں کے لئے جاگیر خانہ پور (ضلع بیدر۔ دکن) کے مندر کو جاگیر دی۔ بلدیوجی کے مندر واقع مضافات متھرا کے مصارف کے لئے بہت سے مواضعات عطا کئے جو اس مندر کے مہنت کے پاس موجود تھے۔ (مضمون بابو رام نرائن منیجر ریاست رام نگر۔ اخبار ہمدم ۱۹۲۲ء)

راجہ رتن سنگھ کو رتلام (مضافات متھرا) شاہجہاں نے بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ بھائیوں میں باہم نزاع ہوئی تو عالمگیر سے بڑے بیٹے نے فریاد کی عالمگیر نے اس کو بداگانہ جاگیر پرگنہ سیتامؤ میں عطا کی۔ (واقعات ہند)

ایک ہندو منگل پانڈے نے ایک مقدمہ میں عالمگیر کا فرمان پیش کیا تھا جس کا ترجمہ کرنل ڈی۔ سی۔ گلاٹ نے کیا تھا (تفصیل کے لئے دیکھو ہسٹی بنارس مؤلف نرنجن داس اور فوٹو فرمان مندرجہ پیسہ اخبار لاہور ۱۹۲۶ء)

(ترجمہ فرمان موسومہ ابوالحسن حاکم بنارس)

ہماری سچی شریعت اور پاک مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیمی مندروں کو گرایا جائے ہماری اطلاع میں یہ بات آئی ہے کہ بعض حکام بنارس اس گرد و نواح کے ہندوؤں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور ان کے مذہبی معاملات میں

دخل دیتے ہیں اور ان برہمنوں کو جن کا تعلق پرانے مندروں
سے ہے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ حکم دیا جاتا
ہے کہ آئندہ کوئی شخص ہندوؤں اور برہمنوں کو کسی وجہ
سے تنگ نہ کرے نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرے۔ مورخہ
۲۵ رجادی الاول ۱۰۶۵ھ سنہ ہجری۔

نوٹ:۔ مگر سنہ غلط ہے۔ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے ۱۰۶۹ھ ہوگا۔ (تصحیح التواریخ مصنفہ قاضی ظہور الحسن سیوہاروی)

مولانا سید سلیمان ندوی نے مندر کش عالمگیر کی دو عجیب کتابوں کا ذکر فرمایا تھا۔ جن میں ایک تو:۔

مت اچھرا: سنسکرت سے فارسی ترجمہ اجکا مترجم لال بہاری بھوجپوری ہے اور تین مقالوں اور احکام مذہبی ہنود پر مشتمل ہے مترجم نے عالمگیر کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:۔

خلافت پناہ، عادل، مظفر، مجسم داد و کرم، قامع
جفا و ستم ....

"دورش چوں دور قدح پر نشاط"

"وز مانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط"۔۔۔۔۔

مصنف نواب علی وردی خاں کا متوسل تھا مخطوطہ جامع ملیہ دہلی مکتوبہ ۱۲۶۳ھ برائے قاضی غلام محی الدین صدر امین اعلیٰ۔)

رد الکفر بحجۃ القوی مصنفہ عبد القوی نو مسلم (سابقہ نام ہرکشن سامانی) لکھتا ہے۔

"قبل ازیں نام نقیر ہرکشن بود ایمان آورد بر دین حضرت

رسالت پناہ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است و

کفر باطل، کفر را رد ساختہ اسلام را حق شناختہ، نام

خود را عبد القوی نہاد۔ شوال ۱۱۰۱ہجری (۱۰۷۱ھ) از دور

خلیفۃ الرحمانی ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ،

زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" (مخطوطہ جامعہ ملیہ

بحوالہ معارف جلد ۲۳، ۶)

جس سے ظاہر ہے کہ اہل ہنود کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔

ہم یہاں ایک اور نادر کتاب سراج الطریق ترجمہ ناسکیت پران کا اضافہ کرتے ہیں جس میں مصنف نے کمال انصاف کے ساتھ عالمگیر کی رواداری اور اس کی فراخ دلی اور صداقت پسندی اور مدح سرائی میں داد فصاحت و بلاغت دی ہے۔

عنوان کتاب :۔ (سراج الطریق (ترجمہ) ناسکیت پران)

روپ ناتھ کھتری سیگل متوطن سیالکوٹ (پنجاب) نے فصیح و بلیغ فارسی میں سنسکرت سے ناسکیت نامی رشی کے حالات اور تعلیمات کی ترجمانی کی۔

تمہید۔ "حمد ثنایئے کہ چون کرم عام و فضل و تمام آفریدگار یہاں از

احاطۂ حصر و شمار بیرون شد و شکر و ستائشے کہ مانند فیضِ

کامل و رحمتِ شامل خداوند ذی الافضال از حدِّ عدد و

مقدار افزوں بود لائق جناب مقدس جل جلالہ تواند

بود ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ کریمے کہ نیکوکار نیکی پسند بکلکِ قضا در رحم نقشبند۔

رحیمے کہ از امر و نہی کتب سماوی بید شاستر فراواں ابواب

عنایت بر روئے عالمیاں کشادہ، و طریق ہدایت و سبیلِ

غرایب در خورد مبین نموده از جملہ مخلوقاتِ انسانی را بخلعت شرف ممتاز و سرفراز گردانید۔ الخ

وجہِ تصنیف:۔ واضح می گرداند کہ ایں احقر را اکثر اوقات شوق اصغا معنایں فرخندہ آئین سمرت دپوران واقسام آں گریباں گیر خاطر می بود، وقتے بحسب اتفاقات حسنہ حکایتِ ناسکیت را کہ برائے سالکان مسالک غفلت وراہ پیمایانِ وادیِ ضلالت دلیلے جو یم و ہادی مستقیم است استماع نمود، بخاطر ناقص رسید کہ آں را از زبان سنسکرت بہ زبان فارسی ترجمہ نماید۔

در سال از جلوس اند مانوس خدیو زماں خداوند گیہان بادشاہ درویش سیرتِ خدا آگاہ، سلطان ملک خصلت، ولایت دستگاہ مروج آداب خدا پرستی و دینداری قاطع بنیانِ غفلت و ناہوشیاری، موفق بتوفیق زہد و ایزد شناس تارکِ آئینِ غفلت و ناسپاسی، ناہج و مناہج ورع و تقویٰ ناسک مناسک جہد و ہدیٰ گوہرِ درج حقیقت، ایمان اخترِ برج طریقت و ایمان بتن باخلق دمساز و بجاں با حق ہم راز آنکہ باوجود کثرتِ مشاغل سلطنت خلاصہ اوقات را بریاضت و عبادت حق تعالیٰ مصروف میدارد، وباایں ہمہ جاہ وجلال و مکنت۔ اقبال از قہر و غضب الٰہی ہراساں و لرزاں بودہ، خود را از کمترین بندگانِ درگاہ ایزدی می شمارد غالباً توفیق ترجمہ ایں حکایت بدیع اثر ورع و پرہیزگاری

و راستی و دین داری آں بادشاہ حقائق آگاہ است ؎

شاہ عالمگیر غازی بادشاہ دیں پناہ

خسروِ ایزد پرست و عادل و کسریٰ نشاں

وقتِ اُو مصروفِ یادِ ایزدی در جملہ حال

جانِ اُو مشغول ذکرِ خالق اندر جملہ آں

دستش از تائید ربانی موید بے خلاف

نطق اُو از امر و نہی حق تعالیٰ ترجماں

خاطرِ معنی طرازش مطلعِ انوارِ قدس

روح صافی طینتش ہم آشیانِ قدسیاں

جبہہ اش خورشید و از ظلمتِ تہمت بری

خاطرش از کذب ہمچو صبحِ صادق برگراں

داستان غرایب پنہاں را بعبارت فارسی عام فہم ترتیب دارد بہ سراج الطریق موسوم ساخت باب اول آغاز حکایت آفرینش ناسئیت با ازدواں مادرش با اودالک و آں مشتمل بر سہ فصل است۔

(مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن)

(بقیہ صفحہ اورنگ زیب کی مذہبی رواداری)

"اس کے پچاس سالہ عہد حکومت میں ظلم و جبر کا کوئی واقعہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ یہانتک کہ کسی ہندو کے ساتھ بھی اس نے ایسا نہیں کیا۔[1]"

[1] اورنگ زیب ازلین پول ص ۶۴

بیدر اور عالمگیر غازی

از سید محمد بیدری

شہر بیدر حیدرآباد دکن کے جانب مغرب (۸۰) میل پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے تین ہزار فیٹ بلند ہے محل وقوع کے اعتبار سے نافِ دکن کہلاتا ہے سُرخ رنگ کا سنگلاخ حصہ دور تک چلا گیا ہے ہندو دور حکومت میں راجہ بھیم سین کا یہ پائے تخت تھا۔ ورنگل کو جاتے ہوئے علاؤالدین خلجی کا یہاں گذر ہوا۔ تغلقی دور کے مقبوضہ علاقے کا یہ صدر مقام بنا۔ تغلقی سپہسالار اور امرائے کبار میں عمادالملک کے مقابلے میں علاؤالدین حسن بہمنی کو اسی مقام پر کامیابی ہوئی وہ بیدر پر قبضہ کر کے دولت آباد چلا گیا۔ احمد شاہ ولی بہمنی نے بیدر کو بہمنی سلطنت کا پائے تخت بنایا۔ تقریباً دو سو سال بہمنی و بریدی حکمراں خاندانوں کا یہ دارالسلطنت رہا۔

بیدر کی سرزمین میں بہمنی، بریدی، مغلیہ اور آصفیہ خاندان کے حکمرانوں کی یادگاریں جس حالت میں بھی اس وقت موجود ہیں وہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن ثقافت و شائستگی کے علاوہ جاہ و جلال شان و شوکت اور دولت و امارت کا پتہ دے رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی تباہ شدہ حالت میں بھی آبادی لیے در کے محلے۔

فرمان پورہ، دبیر پورہ، چشتیہ پورہ، قادریہ پورہ، فرش پورہ، علوی پورہ، درگاہ پورہ وغیرہ ناموں سے بھی گذشتہ دور کے تاریخی عظمت و تقدس کی جھلک نمایاں ہے سلاطین بہمنی اور شاہان بریدی کے شاندار مقبروں کے علاوہ حالیہ آصفیہ خاندان کے بعض حکمران اور شہزادے بھی یہاں آسودہ ہیں۔ لیکن ان کی حکمرانی اور شان و شوکت ان کے ساتھ ختم ہو گئی البتہ ان اولیائے عظام، صوفیائے کرام، علمائے عالی مقام کی حکمرانی شاہ و گدا کے دلوں پر جو اس وقت تھی، صدیاں گذرنے کے باوجود اب بھی بلاتخصیص مذہب و ملت بندگانِ خدا کے دلوں پر جاری ہے۔ سرزمینِ بیدر کے ہر گوشہ میں کئی بزرگانِ دین آسودہ ہیں۔

از برائے ماندنِ عشاق منزل کردہ اند
خاکِ بیدر را بخونِ عاشقاں رنگل کردہ اند

دکن کے اس عظیم الشان اسلامی دارالسلطنت کے متعلق ثناء اللہ تنریف لکھتے ہیں۔

اعلیٰ مقام تیرا ہے بلند و برتر ۔۔۔ کوہ ہمالیہ سے تو عمر میں ہے بڑھ کر
سرسبز وادیاں ہیں اور دلفریب منظر ۔۔۔ کشمیر کا ہے خطہ گویا دکن کے اندر
اِک سطح مرتفع پہ اے سرزمین بیدر

ہے خاکِ پاک تیری خاک شفا سراپا ۔۔۔ خونِ وفا سے رنگیں ہے تیرا ذرہ ذرہ
ماضی کی روشنی سے روشن ہے چپہ چپہ ۔۔۔ تیرا ہر ایک پتھر تیرا ہر ایک ٹیلہ
تاریخ کا ہے دفتر اے سرزمینِ بیدر

عالمگیر غازی نے جب دیکھا کہ بہمنی و بریدی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا اور بیدر پر عادل شاہی قلعدار سدی مرجان کی قلعداری ہے اور مغل فوج کے مقابلے میں یہ مرہٹوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ مفاد پرست مسلم امرا کی ریشہ دوانیاں بھی مغلوں کے

خلاف بڑھ رہی ہیں سدی مرجان عالمگیری فوج کے مقابلے میں مرہٹوں کے ساتھ ہو کر پانچ مرتبہ میدان میں آچکا ہے۔ اندرونی خلفشار سے زنار داران دکن کو پیر پھیلانے کا موقع مل گیا ہے۔ افہام تفہیم کے باوجود سدی مرجان اپنے افعال سے باز نہیں آرہا ہے۔ ایسی صورت میں عالمگیر غازی نے بیدر کا رخ کیا۔ سدی مرجان کو اس کے کئے کی سزا دینے اور بیدر پر قبضہ کر لینے کا عزم کر لیا۔ اورنگ زیب کے حملہ کی خبر سن کر سدی مرجان نے فصیل بیدر کے دروازے بند کر دئے اور عالمگیری فوج کے مقابلے کا سامان تیار کیا۔ بریدی دور کے منڈلہ برج پر گولہ بارود کا ذخیرہ کیا۔ آبادئ بیدر سے قریب جانبِ مغرب عالمگیری فوج خیمہ زن تھی۔ سدی مرجان نے مغل فوج پر عین اس وقت گولہ باری کی جب کہ فوج نماز کے لئے صف بستہ تھی۔ جیسے ہی توپ چلی بارود کے کوٹھے کو آگ لگ گئی اور اس کے دھماکے سے سدی مرجان اور اس کے دو بیٹے اسی وقت جاں بحق ہوئے۔

عالمگیر غازی کے لئے قدرت کی طرف سے میدان صاف ہو گیا۔ اٹھائیس دن کے محاصرہ کے بعد ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۶۶ھ کو بیدر پر عالمگیر کا قبضہ ہو گیا۔ قلعہ کی چابیاں سدی مرجان کی بیگم نے عالمگیر کی خدمت میں پیش کر دیں۔ ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب نے اس شہر کو محمد آباد بیدر کے بجائے ظفر آباد بیدر سے موسوم کیا اور مغلیہ حکومت کا صوبہ قرار دیا۔ رفعت بیدری نے "نالۂ رفعت" میں اسی نام سے خطاب کیا ہے۔

اے ظفر آباد اے فخرِ دیارِ ردم تمام
اے مسلمانوں کے ملجا اور ماوائے انام

فرس و ترکی و رومی و حبشی ہو جنفی کا مقام
شرق سے تھی غرب تک تیری ہتھیلی دھوم دھام

سر زمیں تیری سدا فخرِ دیارِ ہند تھی
رات دن پیشِ نظر تجھ سے بہارِ ہند تھی

بیدر میں عالمگیری آثار

کالی مسجد جس میدان میں عالمگیری فوج خیمہ زن تھی وہاں عالمگیر نے ایک مسجد تعمیر کر دی۔ یہ فن تعمیر اور سنگ تراشی و بندش کے اعتبار سے مستحکم اور خوبصورت عمارت ہے اور کالی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ ایک عرصہ تک غیر آباد رہی۔ ریلوے اسٹیشن اور گاندھی گنج اس مسجد کے قریب تعمیر ہونے سے منیر الدین صاحب برادر قلعدار بجا تو نے اس کو آباد کیا پنجوقتہ اذان اور نماز کا انتظام ہے۔

فتح برج سدی مرجان قلعدار بیدر نے جس منڈلہ برج سے توپ چلائی تھی عالمگیر نے اس برج کا نام فتح برج رکھا۔ اور ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کر دی۔ فصیل بیدر کے برجوں میں یہ بڑا برج ہے۔ اور بریدی دور کی ایک بڑی توپ اب بھی وہاں موجود ہے جس پر محمود عالی جاہ برید کا کتبہ ہے۔ بیدر کی بڑی توپوں میں اس کا شمار ہے۔

فتح دروازہ عالمگیر اور اس کی فوج جس دروازے سے شہر میں داخل ہوئی سابق میں اس کا نام "نورس دروازہ" تھا۔ عالمگیر نے فتح یابی کی یادگار میں اس کا نام فتح دروازہ رکھا۔ آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ اور شہر کے جنوب میں واقع ہے عالمگیری دور کی آہنی تختی حسب ذیل عبارت کی نصب ہے۔

"روز جمعہ ۱۵ ار شہر ربیع الثانی ۲ کلہ جلوس میمنت مانوس
حضرتِ قدر و قدرت"

"جم جاہ ملائک سپاہ ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب
عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ"

سوافق ۱۰۶۶ھ ہجری نبوی در صوبہ داری کمترین بندگان

مختار خان الحسینی سبزواری "

" ایں دروازہ صورت اتمام پذیر رفت "

سرائے عالمگیری دوسرا اور چار دروازوں پر اسی عبارت کی تختیاں تبدیلِ تاریخ کے ساتھ نصب ہیں فصیل بیدر کے بیرونی حصے میں جانب مغرب محلہ شاہ گنج میں عالمگیری دور کی سرائے اور مسجد ہے ہندوستان میں عموماً اور دکن میں خصوصاً عالمگیری سرائیں اکثر جگہ موجود ہیں۔ یہ سرائے ایک وسیع احاطے میں محصور ہے۔ اور چاروں طرف پختہ سنگِ سیاہ کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ مغربی سمت میں مسجد ہے عالمگیر غازی نے بہ عطائے معاش داروغگی اور پیش امامی مسجد کا بھی انتظام کیا تھا۔ حال تک سید علی اس خدمت کو انجام دیتے رہے اور تقریباً سو سال کی عمر میں ۱۳۹۰ھ کو انتقال ہوا۔ ان کے لڑکے بھی اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ بھارت کے حالیہ احکام برخاستگی انعامات کے سلسلے میں معاش برخاست ہو گئی ہے۔

روضہ شاہ علی قادری الملتانی کالی مسجد کے عقبی حصہ میں حضرت شاہ علی قادری الملتانی رح کا روضہ ہے۔ عالمگیری دور کی سنگ سیاہ کی پختہ کمان دار مسجد ہے کمان پر یہ کتبہ ہے۔

بندہ درگاہ رسول اللہ	سلطان علی ابنِ شاہ خلیل اللہ

مسجد پر یہ کتبہ نصب ہے۔

شد بنائے ایں مکانِ فیض بخش	در زمانِ عدل عالمگیر شاہ
گفت برخوردار نیک از روئے عشق	شد بنائے مسجد بتوفیق الٰہ

سال تاریخش ہمی جستم بہ عدل

گفت ہاتف معدنِ فیضِ الٰہ (۱۰۹۰ھ)

حویلی کلاں بیدر کے محلہ منار تعلیم میں آصفیہ دور کی دو حویلیاں ہیں جو چھوٹی حویلی

اور بڑی حویلی کے نام سے موسوم ہیں بڑی حویلی کی شمال رویہ دیوار میں عالمگیری عہد کے چند کتبے نصب ہیں۔ یہ کتبے اودگیر کے قلعہ دار عالم خاں نے اپنے دور قلعداری میں کندہ کرائے تھے۔ اودگیر سے یہ کتبے احمد حسین تعلقدار وقت نے منگوائے تھے۔

یافت در عہد شاہ عالمگیر	قلعداری قلعۂ اودگیر
کمتریں خانہ زاد عالم خاں	کہ بر آں اعتقاد داشت ضمیر
در سنہ الف اربع و تسعین	کرد ایں قصر دلکشا تعمیر

توان کردن تمامی عمر را مصروف آب و گل
کہ شاید یکدمے صاحبدلے درو کند منزل

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع اسی حویلی میں ۲۴ رمضان المبارک ۱۲۰۸ھ کو تولد ہوئے سابق میں یہ کسی قلعدار کا مکان تھا۔ نواب صاحب کی ولادت گاہ ہونے کے سبب مکان میں توسیع ہوئی جو حویلی کے نام سے موسوم ہے۔ آصف نواز الملک معتمد صرف خاص شاہی نے اس کی توسیع میں کافی دلچسپی لی۔

مسجد فرح باغ اورنگ زیب عالمگیر کے مشہور سپہ سالار مختار خان الحسینی سبزواری صوبہ دار بیدر کا باغ ۱۰۸۱ھ کا تیار کردہ مع مسجد ایک پر فضا مقام پر زیرین گھاٹ واقع ہے مسجد پر حسب ذیل کتبہ ہے۔

"چوں ہمت والا خدیو دیں پناہ موئد من عند اللہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب"

9-ز
61

"عالمگیر بادشاہ غازی بر نصرت دین اسلام مصروف و معطوف است۔"

"کمترین بندگان مختار خان الحسینی سبزواری ناظم صوبہ ظفر آباد

تخریب بت خانہ"

"مسجد د باغ پرداخت - بتاریخ بست و پنجم

شہر ربیع الاول سنہ جلوس موافق سنہ ۱۰۸۲ ہجری نبوی"

"مطابق ایں مصرع تاریخ شد"

"بت کدہ مسجد شدہ از لطف حق"

"بعنایاتِ ملک العلام صورت اتمام یافت از نمایت

خوبی و دلنشینی بہ باغ فرح"

"موسوم گردانید - بفرزند دلبند از عمر و دولت برخوردار

نجم الدین محمد خلف فرزند سعادت مند مرزا قمر الدین

محمد یحییٰ ساخت"

مسجد کے عقبی جانب گھاٹ کے زیرین حصہ میں پانی کی دور تک سرنگ چلی گئی ہے سرنگ کے آخری حصہ میں مندر ہے - ہندو ہر روز جاتے اور اپنے رسوم ادا کرتے ہیں - اس وقت فرح باغ پر کامل طور پر ہندو قابض ہیں - پولس ایکشن کے بعد مسجد کا کچھ حصہ شہید کر دیا ہے - اور مسجد کو بھی اپنے تصرف میں لا رہے ہیں -

روضہ شاہ علی قادریؒ کالی مسجد کے عقبی حصہ میں جانب مغرب حضرت شاہ علی قادری الملتانی" کا روضہ ہے آپ کے جد اعلیٰ حضرت شاہ فتح اللہ قادریؒ پاکستان کے مشہور شہر ملتان سے بہمنی دور میں بیدر آئے - بیدر میں آپ کا وسیع خاندان ہے آپ کے سلسلہ سے حضرت شاہ علی قادریؒ اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے ، عالمگیر غازی کے دور حکمرانی میں آپ کے روضہ کی پختہ تعمیر ہوئی اور کمان و مسجد بھی اسی دور کی یادگار ہے -

کمان پر یہ عبارت کندہ ہے۔

بندہ درگاہ رسول اللہ سلطان علی ابن شاہ خلیل اللہ

مسجد کے کتبہ میں یہ اشعار کندہ ہیں۔

شد بنائے ایں مکانِ فیض بخش در زمانِ عدلِ عالمگیر شاہ
گشت برخوردار نیک از روئے عشق شد بنائے مسجد بتوفیق اِلٰہ
سال تاریخش ہمیں جستم بہ عدل گفت ہاتف معدن فیض اِلٰہ (۱۰۹۰)

اسی احاطہ میں قادریہ خاندان کے چند بزرگوں کے بھی مزار ہیں اور ایک ناتمام گنبد ہے۔ موٹ کشی کی ایک بڑی باولی ہے جس پر عالمگیری دور کا یہ کتبہ ہے۔

"بعنایتِ الٰہی...... حضرت حسین شہید..... ایں چاہ
نمودہ موسومہ بہ حسین باولی ساخت۔ کمترین خلقِ خدا محمد
مومن طبا طبائی۔ بتاریخ ۵ محرم الحرام ۱۰۸۲ھ ہجری نبوی

علی باغ اندرون فصیل بیدر سلطان علی برید شاہ کا تعمیر کردہ باغ اور کئی محل تھے۔ یہ باغ ایک ہزار گز طویل اور ایک ہزار گز عریض تھا۔ باغ کے ہر حصہ میں تھوڑی تھوڑی دور پر کسیج باولیاں تھیں اور ایک بڑا حوض بھی تھا برید شاہی کے خاتمہ کے بعد یہ باغ بھی اجڑ گیا۔ اور ایک محل میں سرکاری چیتے باندھے جانے لگے۔ جو اس وقت چیتہ خانے کے نام سے موسوم ہے۔ محمد اکرام الدین خاں کاکوروی نے اپنی تعلقداری کے زمانہ میں ۱۳۱۲ھ میں ستر ہزار روپیہ کے صرفہ سے حوض پر مدرسہ فوقانیہ کی عمارت تعمیر کی اور حوض کے بیچوں بیچ عالمگیری قلعدار قلندر خاں کا تعمیر کردہ مکان کا کتبہ نکال کر بیدر کے قلعہ کی مسجد میں نصب کر دیا۔ کتبہ نہایت خوش خط اور جاذب نظر ہے۔ خط نستعلیق ہے اور یہ اشعار کندہ ہیں۔

بہ دورِ شاہِ عالمگیر غازی کہ از عدلش شدہ گیتی منور

قلندر خاں بہارِ باغِ دولت — کہ از بویش جہاں گشتہ معطر
بہ پیش آفتابِ دستِ جودش — بود دریا و کاں از ذرہ کمتر
رواقے ساخت بہر یادگارے — کہ باشد زیر ایں فیروزہ منظر
پئے تاریخ او از طارمِ چرخ — ندا آمد کہ خالِ روئے بیدر (۱۰۰۸ھ)

عالمگیری دروازہ دکن کے قلعوں میں بیدر کا مشہور قلعہ ہے قلعہ کے دروازوں میں ایک دروازہ، شیرزہ دروازہ سے موسوم ہے۔ اس پر بہمنی زمانہ کا عربی رسم الخط میں بے نظیر خطبہ ہے۔ اس دروازے پر عالمگیر غازی نے ایک اور دروازہ آہنی تیار کر کے نصب کرایا جو نہایت شاندار اور مستحکم ہے۔ اس پر حسب ذیل کتبہ ہے۔

"روز چہار شنبہ، ۲۷ رجب المرجب سنہ ۲۹ جلوس میمنت مانوس قدر و قدرت جم جاہ، ملائک سپاہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، موافق سنہ ۱۰۹۳ ہجری نبوی در صوبہ داری کمترین بندگان جاں نثار خاں الحسینی سبزواری ایں دروازہ صورت اتمام پذیر رفت۔"

اسی طرح شاہ گنج دروازہ پر بھی آہنی تختی نصب کر دی گئی ہے اس پر بھی مندرجہ عبارت کندہ ہے البتہ تاریخ پانزدہم شہر شوال سنہ ۴۲ جلوس موافق سنہ ۱۱۰۸ ہجری نبوی صوبہ داری مختار خاں الحسینی سبزواری درج ہے۔

دل ہل رہا ہے قلعہ بیدر کی دید پر — ٹوٹی ہوئی فصیل تو اُجڑے ہوئے کھنڈر
آئینہ دارِ شوکتِ ماضی ہیں بام و در — وہ ہیں تباہیاں کہ لرزنے لگے جگر
ایسی نزاکتیں ہیں کہ سوچا نہیں خیال — رنگیں محل میں جذبۂ رنگینیٔ جمال

چاندنی چبوترہ محلہ منیار تعلیم بیدر میں فصیل کے متصل چاندنی چبوترہ کے نام سے عالمگیر کے دور کے آثار میں شمار ہے۔ مسجد اور محل بھی تھا۔ محل کے آثار تو کچھ کچھ باقی ہیں مسجد خراب وخستہ حالت میں تھی اب آباد کر دی گئی ہے۔ یہ آثار عالمگیری دور میں ملکہ نور جہاں بیگم کے بھائی آصف الدولہ کے پوتے نواب حسام اللہ خاں نے اپنی صوبیداری میں تعمیر کرائے تھے۔ اسی زمانہ کا کتبہ بھی مسجد پر نصب ہے۔ اس کے علاوہ خانقاہ قادریہ پورہ مسجد۔ مدرس پورہ کی مسجد، فتح دروازہ سے باہر کالی مسجد ثانی، درگاہ حضرت مبارک شعلہ رح، عالمگیری آثار میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان میں بعض پر کتبے بھی موجود ہیں۔ جو طوالت کے سبب نہیں لکھے گئے آثار کے علاوہ بیدر کے قرب وجوار میں چند مواضعات ایسے ہیں جو اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے منسوب ہیں۔ موضع اورنگ نگر، موضع اورنگ آباد، موضع عالمگیری اب بھی آباد اور اچھی حالت میں ہیں۔ عالمگیری اسناد میں ان کا ذکر آئے گا۔

خانان پور کی مسجد بیدر سے (۱۲) میل پر خانان پور (خانہ پور) نام کا ایک غیر آباد موضع ہے، بہمنی دور میں یہ آباد تھا۔ عالمگیر غازی کے زمانہ میں بھی یہاں آبادی تھی۔ اس نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ مسجد پختہ اور شاندار ہے۔

فدوی کے پاس جو تاریخی دستاویزات ونوادرات ہیں ان میں بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور برید شاہی فرامین واسناد کے علاوہ شاہجہانی وعالمگیری اسناد بھی ہیں اور فتاویٰ عالمگیری کا اصل وہ مخطوطہ بھی ہے جو عربی زبان میں مرتب ہوا تھا اور مغلیہ کتب خانہ کی زیب وزینت بنا تھا یہ مخطوطہ مطلا اور خوشخط ہے۔ صاف اور سنہری حالت میں ہے۔ ابتداء میں ایک دیباچہ بھی درج ہے اس کے ابتدائی ورق پر کئی مہریں ثبت تھیں ان میں سے تین مہریں نمایاں ہیں باقی کسی نے عمداً مسخ کر دی ہیں۔ ایک مہر علی نقی ۱۰۹۲ھ کی ہے دوسری نواب سراج الدولہ

عمدۃ الملک کی ہے۔

سندات عالمگیری

(۱) بیدر سے ۲۴ میل پر جانب مغرب بہالکی ایک مقام ہے۔ خدمت طبابت کے سلسلہ میں عالمگیر غازی نے حکیم پنڈت نارد متوفی کے بیٹوں کے نام ڈھائی چادر زمین انعام میں دی تھی۔ دیانت خاں فدوی عالمگیر بادشاہ کی مہر ثبت ہے۔

سند کی عبارت ظہری ملاحظہ ہو۔

"گماشتہ ہائے مقدمان مہمات حال و استقبال پرگنہ بہالکی صوبہ محمد آباد عرف ظفر آباد بدانند کہ بموجب تجویز نامہ بمہر سزاوار خاں قلعدار و میر محمد جعفر دیوان صوبہ موازی دو و نیم چاور زمین یکمر شرعی درسی بشرط خدمت طبابت بیماراں و معالجہ رنجوراں سکنہ قلعہ از پرگنہ مزبور بنام لچھمن و دتیا پسران نارد متوفی مقرر گشتہ و مطابق آں پروانہ بشرح دسبط بمہر عمدہ وزرائے عالی شان۔ بلند مکان جملۃ الملک مدار المہام حاصل نمودہ باید کہ موافق سند مذکور عمل نمودہ آراضی مزبور را حسب الضمن بدستور نارد متوفی بتصرف لچھمن و دتیا مذکور واگزارند کہ حاصل آں را صرف نمودہ بجمیعت خاطر تقدیم خدمت پردازند۔ ۱۹ ماہ جمادی الاول ۳۵ جلوس قلمے

(۲) عالمگیر بادشاہ غازی نے بیدر کے ایک بزرگ حضرت شاہ محب اللہ قادری

الملتانی رح کے نام دوسو ساٹھ پر پانچ روپیہ محاصلی کی اراضی مدد معاش کے عنوان سے عطا کی تھی یہ سند ہشتم رمضان سنہ ۵ جلوس کو دی گئی اسی پر چار مہریں ثبت ہیں۔ پہلی مہر امین خاں، مرید شاہ عالمگیر بادشاہ غازی (دوسری) اسد خاں، بندۂ بادشاہ عالمگیر غازی ۱۱۰۸ھ (تیسری) خان جہاں، خانہ زاد بادشاہ محمد عالمگیر غازی ۱۱۱۲ھ (چوتھی) عنایت خاں، خانہ زاد عالمگیر بادشاہ غازی ۱۱۰۶ھ۔

سند کی اصل عبارت بہ نظر طوالت نہیں لکھی گئی۔ آئندہ صرف اسناد کا حوالہ دیا جائے گا۔

(۳) فرمان شاہ جہاں بادشاہ غازی (طغرا) مربع شکل میں ہے۔ اس کے نیچے اورنگ زیب عالمگیر کا بھی طغرا ہے۔ اس کے علاوہ عالمگیر غازی کی مہر بھی ثبت ہے ۱۲ شہر صفر ۱۰۶۸ھ کا زمان ہے۔ پاکستان کے مشہور شہر ملتان سے بہمنی زمانہ میں حضرت شاہ فتح اللہ قادری الملتانی رح فرزند سید ابراہیم قادری الملتانی کو ساتھ لیے ہوئے آئے تھے۔ شاہ فتح اللہ قادری کا مزار بیدر میں جانب مغرب عیدگاہ کے پیچھے ہے۔ شاہ ابراہیم قادری الملتانی علوم ظاہری و باطنی کے سبب دربار بہمنی سے منسلک ہو گئے اور بیدر کے قاضی القضاۃ کی جلیل القدر خدمت عطا کی گئی۔ ان کے تفصیلی حالات کتاب کی صورت میں مرتب ہو چکے ہیں خدا نے چاہا تو جلد از جلد اس کو طبع کر دیا جائے گا۔

(۴) عالمگیر بادشاہ غازی نے سید محمد ہو ہیران بی بی کے نام آٹھ بیگہ زمین معاش کی سند عطا کی تھی۔ اس موضع کرسڑھال پرگنہ نوڑ صوبہ سرکار محمد آباد بیدر کی مسجد سے متعلق بمعاوضہ خدمت امامت و موذنی و جاروب کشی کی شرط درج ہے۔

(۵) بیدر کے متصل دو بیگہ زمین سنگ زار برائے تعمیر مقبرہ حضرت شاہ علی

قادری الملتانی رح بموجب پروانہ قلندر خاں صوبہ دار پنجم شہر ربیع الاول ۱۰۸۹ھ نبوی عالمگیری سند عطا ہوئی ہے۔ حویلی ظفر آباد کے متصدیوں کو بھی مطلع کرنے کی اس میں صراحت ہے۔

(۶) درگاہ حضرت سید عبداللہ صاحب مغربی کے متولی سید ولی کے نام تین چادر زمین مدد معاش بیدر کے مواضعات بردی پاڑ اور علی آباد میں عالمگیری سند کے ذریعہ عطا ہوئی یہ سند ۱۰۶۸ھ کی ہے۔

(۷) سدی مرجان قلعدار بیدر کے بیٹوں کے نام دو چادر زمین مواضعات چلرگی اور پیار ورام میں عطا ہوئی۔ عالمگیر غازی کی شنجرفی رنگ کی مہر مربع شکل میں اس سند پر ثبت ہے۔ اور ایک طغرا بھی ہے اس کے علاوہ عابد خاں اشرف خاں مسعود خاں کی مہریں بھی ثبت ہیں یہ سند ۱۰۷۶ہجری کو عطا ہوئی ہے۔

(۸) افواج بہمنی کے سپہ سالار حکیم فخر الملک گیلانی کا شاندار گنبد بیدر سے ۲میل پر واقع ہے اور اسی سے ملحقہ موضع فتحپور ہے اس مقبرہ کے خادموں میں سید نور کے نام سے عالمگیر غازی نے انعامی زمین عطا کی تھی عالمگیر غازی کی مہر کے علاوہ وزارت خاں عالمگیری کی مہر بھی سند پر ثبت ہے۔

اور بھی عالمگیری دور کی اسناد اور مخطوطات ہیں اس مختصر مقالہ میں ان کو بوجہ قلت گنجائش قلمبند نہیں کیا گیا۔

مدرسہ خواجہ محمود گاواں پر عالمگیر غازی کی شاہانہ توجہ

بہمنی دور میں محمد شاہ بہمنی کا وزیر اعظم خواجہ محمود گاواں نے ذاتی صرفہ سے درس و تدریس کے لئے ایک شاندار عمارت تعمیر کی تھی یہ چار منزلہ عمارت

تھی شرق جانب اس کا صدر دروازہ تھا۔ اس دروازے والی دیوار کے دونوں
گوشوں پر دو بلند مینار تھے روغنی گلکاری اور چینی کے رنگارنگ ٹائلس سے بڑے
بڑے حروف میں آیاتِ قرآنی بڑی خوبی سے چسپاں کی گئی تھیں۔ آج تک
ان کی جِلا اور خوبی عمارت کے باقیماندہ حصے پر دکھائی دیتی ہے۔ ہند اور پاکستان
میں عربی و فارسی علوم کا یہ واحد مرکز تھا۔ دور دور سے علمائے کرام آکر
جمع ہو گئے تھے۔ خواجہ محمود گاواں کے قتل اور بہمنی خاندان کے خاتمہ کے بعد
شاہان بریدی کے زمانہ میں طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا بیجاپور کے عادل
شاہیوں نے بیدر پر قبضہ کیا۔ ایسے زمانہ میں مدرسہ کے درس و تدریس کا انتظام
بھی درہم برہم ہو گیا تھا۔ اور حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں
مدرسہ کے لکڑی کے دروازے صندل و آبنوس کا علم مطلا و مذہب کام کی
چھت بھی اکھیڑ لے گئے اور خالی خولی پتھروں کی عمارت سے ضرورتاً فوجی میگزین کا
کام لیا جانے لگا۔ عالمگیر غازی نے مدرسہ کی بے کسی اور بربادی سے متاثر ہو کر اسکی
درستی اور تعمیر و ترمیم کا انتظام کیا۔ اور حکم دیا کہ پچھلی حالت پر لانے کی کوشش کیجائے
صوبہ داران افتخار خاں، مختار خاں اور قلندر خاں نے اس کو اصلی حالت پر
لانے کی کوشش کی اور اس میں درس و تدریس کا کام بھی شروع کر دیا عالمگیر
غازی نے بیجاپور کے نامور عالم اور مقدس بزرگ مولانا صبغۃ اللہ مدنی
کے جانشین مولانا محمد حسین کو منتخب فرما کر اس مدرسہ کی جلیل الخدمت امام
المدرسین پر مامور فرمایا۔ اور مدد معاش کے طور پر کونٹور وغیرہ مواضعات
جاگیر میں دے دئے۔ دس سال آپ نے خدمت کی اور کئی تشنہ کامان علم
نے فیض پایا جامعہ محمود گاواں کے نام سے میں نے ایک کتاب لکھی ہے
جو مسودہ کی شکل میں ہے۔

مولانا محمد حسین مولانا محمد اپنے وقت کے بزرگ کامل تھے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ان میں سے ایک کتاب کا نام عقائد حسینی ہے۔ عہد عالمگیری میں ۱۱ ار رمضان المبارک ۱۱۰۷ھ ہجری کو آپ مدرسہ کی مسجد میں نماز تراویح پڑھا رہے تھے کہ عمارت مدرسہ پر بجلی گری جس کے صدمہ سے عمارت مدرسہ کا کوئی نصف حصہ منہدم ہوگیا اور مولانا محمد حسین صاحب قبلہ بھی اُسی وقت شہید ہوئے عالمگیر غازی کو اس کی خبر ہوئی۔ سزاوار خاں قلعدار نے عمارت مدرسہ کے ایک حصہ میں بارود رکھ دی تھی جس کے سبب مدرسہ کی عمارت کو زیادہ نقصان پہونچا۔ سزاوار خاں کو معزول کردیا اور آگرہ بھیج دیا گیا۔ مولانا محمد حسین صاحبؒ کا مزار کالی مسجد کے میدان میں ایک حصار کے اندر ہے۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کی روضۂ قدسیاں کے نام کی ایک قلمی کتاب میرے کتب خانہ میں ہے اس میں لکھا ہے کہ مولانا محمد حسین صاحب قبلہ کو عالمگیر غازی نے ہم طعامی کا بھی شرف بخشا تھا۔

عالمگیری قلعدار بیدر میں عالمگیری قلعداروں میں سے قلعدار نواب افتخار خاں ہوئے ۱۱۵۲ھ میں ان کا مالوے کی صوبیداری پر تبادلہ ہوا قلعداری بیدر کے وقت آپ کی بیگم فاطمہ خاتون کا بیدر میں انتقال ہوا ان کا روضہ کالی مسجد کے مغرب میں چار چمن کے نام سے مشہور ہے۔ چھوٹی پختہ گنبد دار مسجد بھی ہے۔ وقت کی تعمیر کردہ ہے آپ کے سلسلۂ خاندان سے بیدر میں ایک محلہ آباد ہے جو قریش پورہ کے نام سے موسوم ہے۔ خاکسار بھی اسی خاندان کی ایک ادنیٰ یادگار ہے روضہ پر میرے افراد خاندان قابض و متصرف ہیں۔ میرے والد مولوی سید اسد اللہ صاحب اور والدہ مرحومہ اور دوسرے بہت سے افراد خاندان اسی روضہ میں آسودہ ہیں

افتخار خاں کے بعد خان زماں خاں ولد خان اعظم خاں جہانگیری قلعدار ہوئے ان کی مدت قلعداری چھ مہینہ ہے۔

خان زماں خاں کے بعد مختار خاں سبزواری ١٠٨٥ھ میں قلعدار ہوئے ان کا مالوہ تبادلہ ہونے پران کے بیٹے جاں نثار خاں قلعدار ہوئے ان کے زمانہ میں عالمگیر بادشاہ غازی نے ١٠٩٨ھ ہجری میں گولکنڈہ کے بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کو ایک سال تک بیدر کے قلعہ میں رکھا۔

جاں نثار خاں کے بعد آصفیہ خاندان کے جد علی خواجہ عابد قلیچ خاں بیدر کے قلعدار مقرر ہوئے۔ عالمگیر کے ساتھ گولکنڈہ کے محاصرہ میں آپ شہید ہو گئے ان کے بعد رستم   خاں بیدر کے قلعدار ہوئے۔ یہاں سے حیدرآباد کی قلعداری پر گئے۔ رستم   خاں کی جگہ قلندر خاں ١١٠٣ھ ہجری میں بیدر کے صوبہ دار ہوئے قلندر خاں کی جگہ ان کے بیٹے قباد خاں کو ملی۔ قباد خاں کے اڑیسہ کی صوبیداری پر جانے سے حسام الدین خاں ان کی جگہ قلعدار ہوئے ١١١٠ھ میں عالمگیر کی طرف سے حسام الملک کا خطاب عطا ہوا۔

حسام الدین خاں کے بعد مکرر خان زماں خاں آئے لیکن چند روز رہ کر اورنگ آباد چلے گئے ان کی جگہ جلال الدین خاں ہوئے لیکن بہت جلد علیحدہ کر دئے گئے۔

جلال الدین خاں کے بعد حسام اللہ خاں کے بیٹے سرافراز خاں صوبہ دار ہوئے۔ مدرسہ محمود گاواں پر بجلی گرنے کے بعد آپ کو اودگیر بھیجدیا گیا اور ان کی جگہ راجہ انوپ سنگھ قلعدار مقرر ہوئے۔ یہاں تک عالمگیری دور کے قلعداران بیدر کا اندراج کر دیا گیا ہے۔

حضرت عالمگیرؒ اور علامہ اقبالؒ

از سید عبدالواحد

حضرت عالمگیرؒ کی شخصیت جامع کمالات تھی - یہ سریر آرائے مسند بھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک بوریا نشین درویش بھی، ایک بہادر اور جری سپاہی بھی تھے اور ایک عالم باعمل بھی دنیا کے ایک بڑے فاتح بھی تھے اور تہجد گذار عزلت نشین بھی - امور سلطنت کے انتظام کے ساتھ ساتھ یاد الہٰی بھی جاری رہتی تھی - ظاہر ہے کہ ایسی ہمہ گیر اور عظیم شخصیت میں علامہ کے حساس اور مردم شناس دل کے لئے بہت سا سامانِ جاذبیت موجود تھا - دراصل علامہؒ کو تو حضرت عالمگیر کی ذاتِ گرامی میں اپنے اس شعر کا مظہر نظر آتا تھا -

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ اس دل آویزی اور دل کشی کا نتیجہ ہی تھا کہ جیسے ہی علامہ کو موقعہ ملا حضرت عالمگیر کے مزار پر انوار پر اظہار عقیدت کے لئے حاضر ہوئے - اس حاضری کا ذکر کرتے ہوئے علامہؒ نے عطیہ بیگم کو اپنے ایک خط میں ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء کو لکھا: "حیدر آباد سے واپسی پر مجھکو حضرت عالمگیر کے مزار پرانوار پر بھی حاضری دینی تھی - حضرت پر میں ایک ایسی معرکۃ الآرا نظم لکھوں گا جس کی نظیر اردو خواں اصحاب کی نظر سے نہ گذری ہوگی" اس کے بعد ۱۷ اپریل ۱۹۱۰ء کو اس امر کا اظہار کرتے ہوئے کہ ان دنوں طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوئی ہے ایک بار پھر لکھا - "شاید حضرت عالمگیر پر جن کے مزار پر انوار کی زیارت کی سعادت

حال ہی میں نصیب ہوئی تھی میری نظم آخری نظم ہوگی۔" یہ دنیائے ادب کی بدنصیبی تھی کہ مکروہاتِ زمانہ نے علامہ مرحوم کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے نیک ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتے، مگر علامہؒ نے اس نقیر نقش شہنشاہ کو اپنا خراج عقیدت ان اشعار میں پیش کیا ہے جو رموز بیخودی میں شامل ہیں۔ اور جب تک دنیا میں فارسی زندہ ہے اور دنیا میں اہلِ دین موجود ہیں یہ پڑھنے والوں کی روحوں کو گرماتے رہیں گے۔ اور ان کے ایمانوں کو تقویت پہونچاتے رہیں گے۔ ان اشعار کا تفصیلی ذکر تو ہم بعد میں کریں گے۔ یہاں ایک اور اہم واقعہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے وہ اشعار جو رموز بیخودی میں شامل ہیں ابھی تصنیف نہیں ہوئے تھے کہ سنہ ۱۹۱۰ء ہی میں علامہؒ نے اپنی عقیدت کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے ایک اور موقعہ نکال لیا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں علامہؒ نے بعض موضوعات پر اپنے خیالات کو ایک بیاض میں قلمبند کرنا شروع کر دیا تھا۔ ویسے تو اس بیاض میں علامہؒ نے اپنے خیالات عالی کا اظہار نہایت اختصار سے کیا ہے مگر حضرت عالمگیر کے متعلق اپنے تاثرات کو ایک خاصہ طویل شذرہ میں قلمبند کیا ہے۔ اس شذرہ میں علامہ نے حضرت عالمگیرؒ کی بابت نہایت مخلصانہ مگر بہت جچے تلے الفاظ کا اظہار کیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں "حضرت اورنگ زیب کا سیاسی شعور نہایت جامع تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا واحد مقصد اس ملک کی مختلف اقوام کو ایک ہمہ گیر سلطنت میں ضم کرنا تھا" اس شذرہ میں آگے چل کر علامہؒ فرماتے ہیں "شیواجی ان کی حکومت کی وجہ سے معرض وجود میں نہیں آیا تھا، اس مرہٹہ کو رُو بکار لانے کا اصلی سبب وہ معاشی اور سیاسی تحریکات تھیں جن کا اصل محرک اکبر کا سرتاپا غلط طرز عمل تھا، اورنگ زیب کا سیاسی شعور بالکل صحیح اور صائب ہونے کے باوجود ذرا دیر میں ظہور پذیر ہوا۔ پھر بھی ان کے سیاسی شعور کی ماہیت پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ اورنگ زیب

ہی کو در اصل اس برصغیر میں اسلامی قومیت کا اصلی بانی قرار دیا جانا چاہئے" علامہ مرحوم کو اپنی اس رائے پر یقین واثق تھا۔ لہذا فرماتے ہیں مجھ کو یقین ہے کہ آئندہ نسلیں ایک دن میری اس رائے کی صحت کی معترف ہوں گی۔" علامہؒ اعلیٰ پایہ کے ادبی فنکار تھے۔ اور اپنی ہر تصنیف میں خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں الفاظ کا انتخاب نہایت ذوقِ سلیم سے کرتے تھے۔ میں نے یہاں علامہ کے تاثرات کا ترجمہ اپنی بھونڈی زبان میں کر دیا ہے مگر یہ پورا شذرہ اصل میں انگریزی میں ایک دریائے معنے لئے ہوئے ہے۔

آج جب کہ ہم ہند پاکستان کے برصغیر کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو علامہ کے ایک ایک لفظ کی صداقت کا یقین ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے یہ شذرہ زیادہ طویل نہیں ہے مگر اس کے ہر لفظ سے علامہ کے تاریخی وجدان اور حقیقت شناسی کا اظہار ہوتا ہے کاش کو ائف زمانہ علامہ کو اتنی مہلت دیتے کہ علامہ حضرت عالمگیرؒ پر کوئی ضخیم تصنیف رقم فرماتے علامہ کو ہمیشہ تاریخ کے مطالعہ کا شوق رہا۔ اور وہ تاریخ کی قومی روایات کی تعمیر میں اس اہمیت کو خوب سمجھتے تھے لہذا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ حضرت عالمگیرؒ پر کوئی کتاب لکھتے تو انگریز اور ہندو مصنفین کے جھوٹے پروپیگنڈے اور دروغ بیانیوں کا ایک منہ توڑ جواب ہوتا۔ ویسے تو انگریز اور ہندو مصنفین ہمیشہ حضرت عالمگیر کی بابت دروغ بیانی سے کام لیتے رہے مگر ان دروغ گویوں کا سربراہ ایک شخص جادو ناتھ سرکار تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکار نے اپنی زندگی کا واحد مقصد اسلام کے مجاہد اعظم حضرت عالمگیر کے خلاف پروپیگنڈا قرار دیا تھا، برسوں کی محنت اور جانفشانی سے کام لے کر اس ہندو مصنف نے غلط بیانی اور افترا پردازی کا ایک ضخیم دفتر پانچ جلدوں میں تیار کر دیا ہے اور یہ بدنصیبی ہے کہ کسی مسلمان مصنف نے اس متعصب ہندو

مصنف کا قابل پذیرائی جواب نہیں دیا۔ جیسا عرض کیا گیا ہے کہ علامہ کو تاریخ اور خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ سے گہری دلچسپی تھی مگر ان کے سامنے اور ضروری کام تھے جن کے لئے مشیت ایزدی نے ان کو منتخب کیا تھا پھر بھی کچھ تو جادو ناتھ سرکار کے زہر آلود پروپیگنڈا کے ردعمل سے اور کچھ اس ولولے کے تحت جو حضرت عالمگیر کی تربت کی زیارت سے پیدا ہوا تھا علامہ نے ۱۹۱۷ء میں فارسی کے وہ چھبیس اشعار قلمبند کئے جو گو تعداد میں کم ہیں مگر حقیقت میں اپنے اندر ایک دریا معنی لئے ہوئے ہیں۔ ان اشعار کے ایک ایک لفظ سے حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ان اشعار میں سے چند پیش کئے جاتے ہیں۔

شاہ عالمگیر گردوں آستاں — اعتبار دودمان گورگاں
پایۂ اسلامیاں برتر ازو — احترام شرع پیغمبر ازو
درمیانِ کارزارِ کفر و دیں — ترکشِ ما را خدنگ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید — باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دل در سینہ ہا روشن نبود — ملتِ ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را — آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را
از پئے احیائے دیں مامور کرد — بہر تجدید یقیں مامور کرد
برق تیغش خرمن الحاد سوخت — شمع دیں در محفلِ ما برفروخت
کور ذوقاں داستاں ہا ساختند — وسعت ادراک اُو نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود — چوں براہیم اندریں بتخانہ بود

در صفِ شاہنشہاں یکتاستے
فقر او در ترکشش پیداستے

ان اشعار کی تشریح میں ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے یہاں اس تشریح کی

تو گنجائش نہیں پھر بھی چند خیالات کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جیسا کہ خود اشعار سے ظاہر ہے پہلے بند میں علامہ نے حضرت عالمگیر کی شخصیت پر جامع اور بصیرت افروز تبصرہ سپرد قلم کیا ہے علامہ فرماتے ہیں کہ حضرت عالمگیر کی ذات بابرکات نے اس برصغیر میں اسلام اور پیروانِ اسلام دونوں کا مرتبہ بلند کر دیا اور اس مردِ مومن نے اس ملک میں شریعت نبوی کا احترام دوبارہ قایم کیا۔ یہ ہی نہیں ذرا حقیقت حال پر غور کیا جائے تو یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ اس برصغیر میں دین اور کفر کے درمیان جو جنگ صدیوں تک جاری رہی اس میں عالمگیر کا وجود دراصل اسلام کے ترکش کا ہی تیر تھا۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

یہ مصرع بلاغت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ علامہ مرحوم نے ایک بار مرحوم دین محمد صاحب سے فرمایا تھا کہ انہوں نے اس مصرع پر چالیس بار نظرثانی کی تھی تب کہیں اس مصرع نے اپنی موجودہ صورت اختیار کی۔ اللہ اللہ حکیم الامت علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر کی نظروں میں حضرت عالمگیر کا مقام کتنا ارفع و اعلیٰ تھا کہ اس کے اظہار کے لئے الفاظ کی تلاش میں کتنی کاوش کرنی پڑی۔

آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں کہ اکبر جیسے مرتد نے کفر و الحاد کا جو تخم ہندوستان میں بویا تھا اور جس کی آبیاری دارا شکوہ جیسے گمراہ نے دوبارہ کی تھی ان ناپاک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ملت اسلامیہ کے لئے اس ملک میں ایسے خطرات پیدا ہو گئے تھے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے موقع کی نزاکت کا بر وقت مقابلہ کرنے کے لئے اس مرد غازی حضرت عالمگیر کو منتخب کیا۔ یہ عالمگیر وہی تھا جس کی ذات میں قدرت نے فقر اور سلطنت کو یکجا کر دیا تھا اس مرد مجاہد نے دارا شکوہ کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور اس برصغیر میں دین کا چراغ دوبارہ

روشن ہوا۔

کور ذوقاں داستانہا ساختند

وسعتِ ادراکِ اُو نہ شناختند

متعصب اور کوتاہ بیں مورخوں نے جن میں فرنگی بھی شامل ہیں اور ہندو بھی اس مردِ مجاہد کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی داستانیں گھڑلی ہیں، یہ کوذوق اس عالی مرتبت انسان کی دور اندیشی، انتظامی قابلیت اور اعلیٰ سیرت کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر تھے۔ تعصب نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔

انہیں لے دے کے ساری ہسٹری میں یاد ہے اتنا

کہ عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اس مردِ مومن کو اللہ تعالیٰ نے احیائے دین اور تجدیدِ یقین کے لئے مامور فرمایا تھا اور وہ تمام عمر اسی عظیم نصب العین کے حصول کے لئے کوشاں رہا۔ اس درویش بادشاہ کا مقصدِ حیات جہانداری نہ تھا بلکہ خدمتِ خلق تھا۔ اس بند کو علامہ نے اس شعر پر ختم کیا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں کی فہرست میں عالمگیر کا کوئی ثانی نہیں، اور اسلام کی جتنی خدمت اس مردِ مجاہد نے کی ہے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی ہے جس طرح اس کی زندگی ایک لاثانی مثال ہے خدمتِ دین کی اسی طرح اس کی تربت ہے جو خلد آباد کے قبرستان میں اولیاء اور بزرگوں کے مزاروں کے جوار میں واقع ہے اک شانِ فقر ظاہر ہوتی ہے۔

در صفِ شاہنشاہاں یکتاستے

فقرِ او از تربتش پیداستے

علامہ کے نزدیک فقر کا مقام بہت اعلیٰ ہے اور ان کی نظروں میں اسلام کا

دوسرا نام ہی فقر ہے۔ فقر بنتا ہے ذکر او فکر کے امتزاج سے ایک جگہ علامہ نے فرمایا ہے

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ اور کمالِ جنوں

الغرض حضرت عالمگیر کے فقر کی طرف اشارہ کر کے علامہ نے دراصل اس مردِ مومن کے عالی مقام کو واضح کر دیا ہے۔ عالمگیر کی اسلامی سیرت کے بعض روشن پہلوؤں کی وضاحت کرنے کے بعد علامہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک دن نماز فجر سے پہلے جنگل کی طرف سیر کے لئے نکل گئے۔ اسی سیاحت کے دوران نماز کا وقت آگیا تو اس مردِ مسلمان نے جنگل ہی میں نماز کی نیت باندھ لی، اتفاقاً اس طرف ایک جنگلی شیر نکل آیا اور حضرت عالمگیر پر جو نماز ادا کر رہے تھے حملہ آور ہوا، ظاہر ہے کہ شیر کے حملے سے دوسرا کوئی انسان ہوتا تو حواس باختہ ہو جاتا مگر عالمگیر نے معاً خنجر نکال کر شیر کا پیٹ چاک کر دیا اور شیر کو اس طرح ہلاک کر کے پھر ادائیگی نماز میں مشغول ہو گئے اس واقعہ سے علامہ نے یہ سبق حاصل کیا ہے۔

قوتِ ایماں حیات افزایدت — وردِ لا خوف علیہم بایدت
ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است — شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد علامہ نے اپنے لطیف پیرایہ میں اپنا تصورِ حیات پیش بیان کر دیا ہے، جسکی اساس انکا فلسفۂ خودی

خویش را در باز و خود را باز گیر — دام گستر از نیاز و ناز گیر

دیکھا جائے تو علامہ نے حضرت عالمگیر کی زندگی کے ایک واقعہ سے ناز و نیاز کے انداز بیان میں ایک مردِ کامل کی زندگی کا راز بتا دیا ہے اور بالآخر اس قصہ کے خاتمہ پر ایمان کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس — خوفِ غیر از شرکِ پنہان است و بس

الغرض علامہ نے ان چھبیس اشعار میں حضرت عالمگیر کے خلاف جو کچھ جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا ہے اس کا منہ توڑ جواب دے دیا ہے۔ جسکی مثال مشکل سے ملے گی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے علامہ مرحوم حضرت عالمگیر کی روحانی عظمت اور قوت ایمان کے دل سے معتقد تھے اور جن حوالہ جات کا ابھی ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی علامہ نے اپنی نثر اور نظم میں حضرت عالمگیر کا ذکر کیا ہے، اور جہاں بھی ذکر کیا ہے وہاں بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ پیام مشرق میں جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی علامہ نے ایک نظم "عالمگیر" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں دراصل عالمگیر کے اس خط کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے ابو المعظم شمس الدین محمد کو لکھا تھا۔ جب حضرت عالمگیر کو معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا ان کی موت کی دعا کر رہا ہے تو انہوں نے شہزادے کو لکھا کہ اے نادان یہ تیرا خیال غلط ہے کہ وہ ربِ ذوالجلال محض تیری آرزو پوری کر کے مجھ کو قبل از وقت موت دے گا۔ دنیا کا تو ہر کام مشیتِ ایزدی کے تحت ہوتا ہے۔ یوں انسان کی جا اور بے جا خواہشوں کی تکمیل کے لئے کارروائی ہونے لگے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ اس نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

پند آں کہنہ نخچیر گیر ۔۔۔ بدام دعائے تو گردد اسیر

الغرض علامہ کو اس مجاہد اعظم کی شخصیت سے گہری عقیدت تھی اور اس عقیدت کا اظہار انہوں نے اکثر مقامات پر کیا ہے جن میں سے یہ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

جب حضرت عالمگیر کا خیال آتا ہے تو علامہ کے یہ اشعار معاً یاد آ جاتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

بلاشبہ وہ عالی مرتبت انسان صحیح اور حقیقی معنوں میں مردِ مومن تھا اور مومن علامہ کے یہاں معراجِ انسانیت کا مظہر ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے اقوال

از محمد رحیم دہلوی

غفلت چھوڑ دو اور اپنی فکر کرو، موت شہ رگ سے قریب ہے۔

عقلمند وہی ہے جو آج کو غنیمت جانے۔

حال کا رخ جانے کی طرف ہے اور مستقبل کا رخ آنے کی طرف۔

اوروں کو نصیحت کرنے سے بہتر ہے کہ خود عمل کرو۔

میں فطرتاً خدا آشنا پیدا ہوا تھا۔ افسوس دنیا کے جھمیلوں میں سب کچھ بھلا بیٹھا۔

جو سانس خدا کی یاد کے بغیر چلا گیا، اس کا افسوس کرو۔

مجھے تو رعیت پروری اور ملک داری بھی نہ آئی۔ عمر عزیز مفت گنوائی۔

وہ مجھ میں موجود ہے اور نظر نہیں آتا۔

زندگی ناپائدار ہے۔

عمر جتنی گذر گئی نہ معلوم کہاں کھوئی۔

جب میں نہ رہا تو اور کون رہا۔

کشتی دریا میں ڈال دو جو ہونا ہے ہو جائے گا۔

اچھا برا جو کچھ لیا ہے اسے خود بھگتنا پڑے گا۔

اکیلا آیا تھا اور گناہوں کا قافلہ لئے جا رہا ہوں۔

بندوں کی خبر گیری خدا کے ہاتھ تو ہے ہی، مگر بادشاہ پر بھی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے۔

کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس سے مسلمانوں کا خون بہے۔

آخرت کا خیال مارے ڈال رہا ہے۔

کوئی فیصلہ شریعت کے خلاف نہ ہونا چاہیئے۔

مجھے ننگے سر دفن کیا جائے، شاید خدا کو اس صورت پر رحم آئے۔

ایرانی جاہ طلب ہیں، مگر ان سے جری اور ثابت قدم بھی کوئی نہیں۔

تورانی اچھے سپاہی ہیں، لوٹ مار اور شبخون کے کام خوب انجام دیتے ہیں، مگر میں معرکہ میں منہ موڑ جاتے ہیں۔

سیدوں کا احترام ضروری ہے۔

سادات بارہہ سے محتاط رہنا چاہیئے، وہ فرمانروائی کے طالب ہیں۔ ذرا ڈھیل دی تو پشیمانی ہوگی۔

بادشاہ کو چاہیئے ہمیشہ ملک کا دورہ کرتا رہے۔ کہیں جم کر نہ بیٹھے۔

ملکی معاملات میں اولاد پر ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔

سلطنت کی پائداری ملک کی خبر داری پر منحصر ہے۔

میں نے شیوا کو ذرا سی ڈھیل دی تھی اس لئے ساری عمر اس کی تلافی میں گذارنی پڑی۔

بادشاہ کے پاس جو املاک اور خزانے ہیں وہ اس کی میراث نہیں ہیں وہ ملک و ملت کی امانت ہیں۔

شاہِ وقت پر بھی قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا جا سکتا ہے۔

امورِ جہانبانی میں ہم حضرت عمر فاروقؓ کے پیرو ہیں۔

پارسیوں کو بد مذہب ایرانی کہنا نامناسب ہے۔

مذہبی امور میں تعصب کو دخل نہ ہونا چاہیئے۔

کوئی حاکم فیصلہ میں رو رعایت نہ کرے۔

راہ داری وصول کرنی راہ زنی ہے

کسی جرائم پیشہ کو کہیں پناہ نہ دی جائے۔

رعایا میں سے جس کو بادشاہ پر دعویٰ کرنا ہو کر سکتا ہے۔

کوئی گرفتار شخص مجرم نہ ہو تو فوراً رہا کیا جائے۔

ہر جگہ بچوں کو سرکاری خرچ سے تعلیم دی جائے۔

مقدموں میں ناواجب تاخیر غلط ہے۔

جب تک دم میں دم ہے کام باقی ہے۔

خدا کی طرف سے میرا فرض ہے کہ میں اپنی رعایا کو ظلم و تشدد سے بچاؤں۔

میں جس مقام پر ہوں دنیا سے تعلق اُٹھائے ہوئے ہوں اور اپنے اوپر مرنا آسان کئے ہوئے ہوں۔

مسلمان مسلمان کی مدد کرے۔

ہماری جہانبانی حضرت عمر فاروقؓ کے طرزِ عمل کی تابع ہے فتح عراق میں انہوں نے اپنے ایک غلام کی دی ہوئی امان کو اپنایا تھا۔ ہم نیکنام خاں کے معاہدے کو اپنا معاہدہ قرار دیتے ہیں۔

مسلمانی سرمایۂ جاودانی ہے۔

خدا ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں دیتا۔

شاہی خزانے شخصی جائداد نہیں۔ وہ رعا کی بہبود کے لئے اندوختہ ہیں۔

فتح خدا کے حکم کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

بادشاہ کی جرأت میں فرق آئے تو سلطنت نہیں رہتی۔

عزت و ذلت حکم الٰہی پر منحصر ہے۔

جو آدمی اپنے نفس کو ذلیل رکھتا ہے اللہ اس کو عزت سے نوازتا ہے۔

(ماخوذ از عالمگیر نامہ مآثر عالمگیری فتوحات عالمگیری منتخب اللباب آداب عالمگیری و رقعات عالمگیری۔)

زیب النساء بیگم

از بیگم ممتاز معین لیکچرار، کراچی کالج فار ویمن

زیب النساء بیگم، شہنشاہ عالمگیر کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس کی والدہ کا نام دل رس بانو بیگم تھا۔ جو جہانگیر کے ایک درباری بدیع الزماں کی لڑکی تھی۔ بدیع الزماں کی عمدہ خدمات کے صلہ میں جہانگیر نے اس کو شاہ نواز خاں کا خطاب عطا کیا تھا شاہ جہاں بھی اس سے خوش تھا۔ چنانچہ اسی لئے شہزادہ اورنگ زیب کی شادی دل رس بانو کے ساتھ کی تھی

زیب النساء ۱۶۳۸ء میں دولت آباد میں پیدا ہوئی چند سال بعد اس کی تعلیم کی ذمہ داری ایک مسلمہ حافظہ مریم کے سپرد کی گئی۔ زیب النساء نہایت ذہین تھی چنانچہ اس نے بہت جلد کلام اللہ حفظ کر لیا۔ اور فارسی و عربی پڑھنا شروع کر دیا۔ قرآن حفظ کرنے پر اورنگ زیب کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے تیس ہزار اشرفیاں اپنی بیٹی کو بطور انعام دیں۔ تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی میں اچھی استعداد حاصل کی۔ اس کے علاوہ فنِ خطاطی میں بھی مہارت رکھتی تھی۔ ماثر عالمگیری کا بیان ہے کہ وہ نسخ، نستعلیق اور شکستہ خوبی کے ساتھ لکھتی تھی۔ شہزادی کو علم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، اس کے اساتذہ میں ملا سعید اشرف ماژندرانی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ عالمگیر کے پہلے جلوس کے موقع پر ایران سے برصغیر آئے اور جلد ہی ان کو شہزادی کا استاد مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت زیب النساء کی

عمر اکیس سال تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالم گیر کی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اور اس میں شک نہیں کہ علم و فضل میں اس نے کمال حاصل کیا مرآۃ العالم کے مصنف بختاور خاں کے الفاظ یہ ہیں۔

"از تحصیلِ علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام اندوختہ" ملا سعید شاعر بھی تھے اور زیب النساء انھیں سے اصلاح لیتی تھی۔ اس کا تخلص مخفیؔ تھا۔ اس کو شعر گوئی سے شغف بھی تھا۔ اور طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ چنانچہ اس کے اشعار اعلیٰ پایہ کے ہیں لیکن یہ افسوس ہے کہ اس کے بہت کم اشعار ہم تک پہونچے ہیں۔ ملا سعید اشرف کے ذکر میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ زیب النساء کی بیاض اس کی ایک کنیز کے ہاتھ سے حوض میں گر گئی اور ضائع ہو گئی ممکن ہے یہ بیان صحیح ہو لیکن یہ یقینی امر ہے کہ اس وقت اس کے بہت کم اشعار ملتے ہیں۔ اس کے نام سے دیوان مخفیؔ جو شائع ہوا ہے وہ یقیناً اس کا نہیں ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ معارف کی جلد ۱۱ نمبر ۵ میں شائع ہوا ہے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ دیوان ایک اور شاعر مخفی رشتی کا ہے جو شاہ جہاں کے زمانہ میں برِصغیر آیا تھا۔ شاہی دربار تک اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ اس لئے اس کا کلام مشہور نہیں ہوا۔ بعد میں بعض مصنفوں نے تخلص ایک ہونے کی وجہ سے اس کے سارے دیوان کو زیب النساء سے منسوب کر دیا۔

بعض تذکروں میں زیب النساء کے کچھ شعر نقل کئے گئے ہیں ان میں دو یہ ہیں۔

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نہ شد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نہ شد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت

غنچۂ باغ دلِ ما زیبِ دستارے نہ شد

زیب النساء کو فی البدیہہ شعر کہنے میں اچھی مہارت تھی اور بہت سے اشعار اس کی طرف اس سلسلہ میں منسوب کئے گئے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کی نسبت بے بنیاد ہے۔ ان کے متعلق بعد میں قصے گڑھ لئے گئے ہیں۔ ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تاریخی حیثیت سے صحیح ہو۔ زیب النساء کے پاس ایک قیمتی اور نایاب چینی آئینہ تھا یہ اس کی ایک کنیز کے ہاتھ سے ٹوٹ گیا۔ یہ کنیز جس کا نام روشن تھا شہزادی کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا۔

از قضا آئینۂ چینی شکست

زیب النساء نہایت نرم دل اور بردبار شہزادی تھی کنیز پر غصہ کرنے کی بجائے - اس کو معاف کردیا۔ اور چونکہ اس کے الفاظ حقیقتاً ایک مصرع کی شکل میں تھے اس لئے اس نے بھی جواب میں یہ مصرع ہی کہا۔

خوب شد اسباب خود بینی شکست

(اس مصرع کی خوبی ظاہر ہے اور اس سے اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کس آسانی سے وہ فی البدیہہ شعر کہہ سکتی تھی۔)

زیب النساء صرف شعر ہی نہیں کہتی تھی، نثر نگاری میں بھی اس کو اچھی مہارت تھی۔ اس کے خطوط اور رقعات اس مرتبے کے تھے کہ ان کو جمع کر کے کتاب کی شکل دی گئی تھی۔ اس مجموعہ کا نام زیب المنشآت تھا۔ اس کا کوئی نسخہ اب تو نہیں ملتا لیکن تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے یہ کتاب خود دیکھی تھی۔

تصنیف و تالیف سے زیادہ زیب النساء کی شہرت اس کی علم پروری اور علماء و فضلاء کی سرپرستی کی بدولت ہے۔ اس کو چار لاکھ سالانہ کا جو وظیفہ ملتا تھا

اس کا بیشتر حصہ ایک اکیڈمی پر خرچ ہوتا تھا جو اس نے اپنی نگرانی میں قایم کر رکھی تھی۔ اس کی سرپرستی میں چند تصانیف کی تیاری کا ذکر ملتا ہے جن میں تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ قابل ذکر ہے۔ یہ ملا صفی الدین اردبیلی کشمیری نے کیا تھا اور شہزادی کے نام پر اس کا نام زیب التفاسیر رکھا تھا۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ زیب التفاسیر کے چار حصے ناپید ہو گئے۔ صرف پانچواں حصہ آکسفورڈ کی بوڈلین Bodlian لائبریری میں محفوظ ہے اس میں (۶۱۶) چھ سو سولہ صفحے ہیں اور تاریخ ۱۰۸۱ھ موجود ہے۔ غالباً یہ نسخہ خود مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زیب النساء کی علم پروری، ذہانت اور حسن اخلاق نے اسکو ہر دلعزیز اور مقبول بنا دیا تھا۔ خود عالمگیر کو بھی وہ بہت عزیز تھی۔ (جشن جلوس کے موقع پر جو انعامات دیے جاتے تھے اس وقت اس کو بھی گراں قدر رقم ملتی تھی۔) لیکن باپ کی اس محبت کے باوجود زیب النساء نے ایک شدید غلطی بلکہ جرم کیا جس کی سزا اس کو عمر قید کی شکل میں بھگتنی پڑی۔

۱۶۸۰ء میں عالمگیر راجپوتوں کی بغاوت فرو کرنے کے سلسلے میں اجمیر میں مقیم تھا اس وقت شاہی فوج کی کمان شہزادہ اکبر کے ہاتھ میں تھی جو زیب النساء کا حقیقی بھائی تھا۔ یہ شہزادہ راجپوت سرداروں کے ورغلانے میں آگیا اور ان سے مل کر اس نے عالمگیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اکبر کی بغاوت سے حالات نہایت نازک ہو گئے کیونکہ تقریباً ساری فوج اسی کے ساتھ تھی۔ اس زمانے میں عالمگیر کے کیمپ کے حالات معلوم کرنے کے لئے اکبر اپنی بہن زیب النساء کو خطوط بھیجتا تھا اور شہزادی اس سے ہمدردی رکھنے کی وجہ سے اس کو ضروری معلومات بہم پہونچاتی تھی۔ یہ خط و کتابت خفیہ طور پر ہوتی تھی اور اکبر کے خطوط ایک عالم ملا محمد عاقل کے لفافوں میں آتے تھے چونکہ زیب النساء کی خط و کتابت علماء سے ہوتی تھی۔ اس لئے اس پر کوئی شک نہ ہوا۔

اکبر کی شکست اور فرار کے بعد یہ خطوط پکڑے گئے۔ اس جرم کی سزا میں عالمگیر نے
زیب النساء کو قید کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ قیدی کی حیثیت سے دہلی لائی گئی اور
یہاں سلیم گڑھ کے قلعہ میں نظر بند کر دی گئی۔ اسی حالت میں اس نے اپنی عمر کے باقی
اکیس سال گذارے آخر کار چونسٹھ سال کی عمر میں ۱۷۰۲ء میں اس نے وفات پائی۔ اور دہلی
کے باہر سی ہزاری میدان میں دفن ہوئی۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے نہ ہوگا کہ خافی خاں کی کتاب
میں عالمگیر کے بیٹوں کی جنگ تخت نشینی کے سلسلہ میں زینت النساء کا نام زیب النساء چھپ گیا
ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ مسٹر ہنری ایٹ Sir Henry Elliot نے بھی یہی غلطی
کی ہے۔ اور زیب النساء کو ۱۷۰۷ء میں زندہ دکھلایا ہے۔ حالانکہ اس کا انتقال ۵ سال
پہلے ہو چکا تھا۔

علوم و فنون کی سرپرستی اور علمی و ادبی فضائل کے علاوہ زیب النساء کا ذاتی اخلاق
و اوصاف بھی قابلِ تعریف ہیں۔ تذکروں میں متعدد واقعات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا
ہے کہ وہ بے حد بردبار اور حلیم الطبع تھی۔ غرباء اور حاجتمندوں پر مہربانی کرتی اور انکی
ضروریات پوری کرنے کی مکمل کوشش کرتی اگرچہ اس کی عمر کے ابتدائی بیس سال شاہجہانی
شان و شوکت میں گذرے تھے۔ لیکن اس کی نجی زندگی سادہ تھی اور اس کا زیادہ
وقت علمی مشاغل اور عبادت وغیرہ میں صرف ہوتا تھا۔

ایسا پاکیزہ اخلاق اور اتنی صلاحیتیں رکھنے والی اس شہزادی پر بعض غیر ذمہ دار
مصنفوں نے عاقل خاں سے تعلقات رکھنے کا الزام لگایا ہے اور اس سلسلے میں بہت سے
جھوٹے قصے بیان کئے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ الزامات تراشنے میں ان لوگوں
نے وہ باتیں کہی ہیں جو زیب النساء تو کیا معمولی اخلاق کی عورت کے متعلق بھی صحیح تسلیم
نہیں کی جا سکتیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان جھوٹے قصوں کی ابتدا کس سے ہوئی
لیکن یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ ہم عصر ہی نہیں بلکہ اٹھارھویں صدی کے بھی سنجیدہ اور

قابل اعتبار مورخ اس واقعہ کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے یورپین سیاح مثلاً برنیر ٹیو رینیڑ اور منوچی وغیرہ میں بھی کہیں اس کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ایسے جھوٹے قصے ایجاد کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ جن سے شاہی خاندان کے افراد یا دیگر سربرآوردہ لوگوں کے کردار پر داغ آتا ہو۔ بہرحال اتنا صحیح ہے کہ سب سے پہلی کتاب جس میں ان افسانوں کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ منشی احمد الدین کی در مکتوم ہے۔ اس مصنف نے اپنا ماخذ ایک دوسری کتاب حیات زیب النسا از محمد الدین بتلایا ہے۔ شعرار کے تذکروں میں بھی بعض اشعار لکھ کر اس قسم کے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

افسانوی رنگ میں زیب النسار اور عاقل خاں کے تعلقات کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اس کو یہاں مختصراً بیان کیا جا سکتا ہے۔ عاقل نے زیب النساء کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا۔ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ عالمگیر کو خبر ہوئی تو اس نے زیب النساء سے شادی کے لئے کہا اور اس نے عاقل خاں کو پسند کیا چنانچہ وہ دربار میں طلب کیا گیا لیکن کسی ناکام رقیب نے اس کو بہکایا کہ شہنشاہ اس کو بلوا کر قتل کرنا چاہتا ہے۔ عاقل خاں ڈر گیا اور ملازمت سے استعفا دے کر بھاگ گیا اس موقع پر زیب النسار نے یہ شعر کہا۔

شنیدم کہ ترکِ خدمت کرد عاقل خاں بہ نادانی
چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

کچھ عرصہ بعد دونوں نے پھر خفیہ طور پر ملنا شروع کر دیا اس کی خبر عالمگیر کو ہوئی وہ ایک موقع پر پہونچ گیا جب کہ عاقل خاں موجود تھا شہنشاہ کے آنے کی خبر سن کر وہ گھبرا گیا اور ایک دیگ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ عالمگیر آیا اور اس نے زیب النساء سے دریافت کیا، دیگ میں کیا ہے شہزادی نے کہا پانی ہے گرم کرنے کے لئے۔ بادشاہ نے کہا اچھا

جاؤاس نے نیچے آگ جلادو۔ وہ گئی اور آگ جلادی اور آہستہ سے عاقل خاں سے کہا۔ اگر سچے عاشق ہو تو آواز نہ نکالنا۔ چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ پروانہ وار جل کر ختم ہو گیا۔

افسانہ نگاروں کے نزدیک یہ قصہ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو تاریخ ان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ کہ عالمگیر جیسے نیک انسان اور اس کی نیک بیٹی پر انہوں نے ایسے غلط الزامات لگا کر ان کو بدنام کیا ہے۔ اب ذرا تاریخی حقائق پر بھی نظر ڈالئے۔

واقعات کا زمانی ترتیب کے ساتھ مطالعہ کرنے سے پہلے یہ بھی غور کیجئے کہ عالمگیر عاقل خاں سے تعلقات کو ناپسند کرتا تھا تو اس نے زیب النساء کو یہ اختیار کیوں دیا کہ خود شوہر کا انتخاب کرے اور جب اس نے عاقل خاں کا انتخاب کیا تو اس کو کس طرح منظور کر لیا۔ دیگ میں جلانے کے سلسلے میں یہ کس قدر مہمل بات ہے کہ اس کو بلوایا گیا۔ کیا شہنشاہ اس کو گرفتار کر کے قتل نہیں کرا سکتا تھا۔ یہ سب باتیں مہمل بلکہ احمقانہ ہیں۔

عاقل خاں کے واقعات مختلف تاریخوں میں مثلاً ماثر الامراء میں ہم کو سنہ وار مل جاتے ہیں۔ وہ اس وقت سے اورنگ زیب کی ملازمت میں تھا جب یہ دکن کا وائسرائے تھا۔ اس پر اورنگ زیب کو بے حد اعتماد تھا چنانچہ بادشاہ ہونے کے بعد معمول کے طور پر ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۶۸۰ء میں وہ دہلی کا صوبہ دار بنا دیا گیا اور اپنی وفات تک جو ۱۶۹۶ میں ہوئی وہ یہیں رہا۔ اس نے باقاعدہ متاہل زندگی بسر کی اور اس کے بیٹے اور داماد کا ذکر ہم کو کتابوں میں ملتا ہے۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ستر (۷۰) سال سے زیادہ تھی۔

عالمگیر سے عاقل کے تعلقات اور ایک دوسرے پر اعتماد کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اورنگ زیب کی بیوی زینب آبادی نے وفات پائی تو

اس کو بے حد صدمہ ہوا۔ اور صدمے کو دور کرنے کے لئے اس نے شکار پر جانیکا انتظام کیا۔ عاقل خاں کو ساتھ جانے کا حکم ملا۔ اس نے کہا ایسی حالت میں شکار کو جانا مناسب نہیں ہوگا۔ اس پر اورنگ زیب نے یہ شعر پڑھا۔

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست

در بیاباں می تواں، فریاد خاطر خواہ کرد

عاقل خاں نے اس موقع پر یہ شعر پڑھا۔ جو اورنگ زیب کو بہت پسند آیا۔ اور اس نے بار بار سنا۔

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود

ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آسان کرد

زیب النساء کی زندگی پر بھی اِک طائرانہ نظر ڈالیے۔ آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ اس کو عشق بازی کی فرصت اور موقع کس طرح مل سکتا تھا؟ جب تک عالمگیر شمال میں مقیم رہا زیب النساء اس کے ساتھ رہی۔ جس وقت زیب النساء قیدی کی حیثیت سے دہلی لائی گئی اس وقت اس کی عمر ۴۳ تینتالیس سال تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں عالمگیر دہلی میں نہ تھا مگر اس عمر میں یہ بھی ظاہر ہے کہ زیب النساء عشق بازی نہیں کر سکتی تھی۔ تاریخی واقعات کی شہادت کے علاوہ اگر ہم زیب النساء کا درویشانہ مذاق زندگی اور طرز رہائش کو بھی ذہن میں رکھیں تو اس کو شہنشاہ کے خلاف بغاوت کا ملزم مان لینے میں تو تامل نہ کریں گے۔ لیکن کسی نوجوان سے عشق بازی اور خفیہ ملاقاتوں کے مذہبی اور سماجی جرم کا مرتکب ہرگز نہ سمجھیں گے۔

زیب النساء ہماری تاریخ کی ان مشہور خواتین میں شمار کئے جانے کے قابل ہے جن پر قوم فخر کر سکتی ہے۔ ایسی پاکیزہ شخصیت پر گندے الزامات لگانا خود ایک اخلاقی جرم ہے۔

عالمگیر

از رشید ہاشمی

اے شہنشہ ابنِ شاہنشہ شہِ ہندوستاں　　مردِ حق آگاہ وحق بیں واقفِ سرِّ نہاں
اے شہِ صوفی منش، زہد و توکل کے نشاں　　ہند کی تاریخ میں اسلام کے رُوحِ رواں

آج جس کی یاد میں ہر اہلِ دل دلگیر ہے۔
وہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ہے

سرزمینِ ہند کے شاہنشہِ عالی وقار　　تو سمجھتا تھا کہ کیا ہے یہ حیاتِ مستعار
صاحبِ فقر و قناعت، متقی، پرہیزگار　　تیرے دورِ سلطنت کا تھا شریعت پر مدار

تیری ساری زندگی خذ ما صفا ودع ما کدر
دین کی تبلیغ تھی ہر دم ترے پیش نظر

علم پرور، عدل گستر، امن کے پیغامبر　　صلح جو، باطل شکن اے صاحبِ سیف و سپر
تو جہانِ آب و گل میں یوں رہا گرمِ سفر　　ہر نفس تیری خدا کی استعانت پر نظر

تیرا طرزِ حکمرانی بے مثال و بے نظیر
تیری ہستی بالیقیں زینت دہِ تاج و سریر

بلخ کا وہ واقعہ، تاریخ کا زریں باب　　جس نے تیری عظمتوں کو کر دیا ہے بے نقاب
لشکرِ اعدا سرِ میدان محوِ پیچ و تاب　　معرکہ میں بر سرِ پیکار تھا پر شیخ و شاب

رزم گہ میں جب کہ امواجِ فنا تھیں تند و تیز
بارگاہِ ربِّ عزت میں ہوا تو سجدہ ریز